اس آدھے آدمی کی کہانی جو پوری دنیا پر حکمرانی
دیکھ رہا تھا۔ سکندرِ ثانی کا فسانۂ عبرت جس کا
ادھورا رہ گیا۔ اس ناول کا صفحہ صفحہ آپ کو
ملکوں کی سیر کرائے گا اور اس کی سطر سطر آپ کو
RAUFTARA
آدھا آدمی
یعقوب کرولوی

چشم وا ہوئی تو فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی اور کھلی کھڑکی سے دھوپ کی ایک کرن جو اندر آگئی تھی نادیہ پنجوانی کی سیاہ زلفوں میں الجھی بے ساختہ ہنس رہی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی اسے پہچان کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ پاکستان سیکرٹ سروس "زیرو ایکس" کے چیف کی آواز تھی اس کی بھاری اور بلغمی آواز ہزاروں میں بھی پہچانی جاسکتی تھی۔

"شہباز...." اس نے میری آواز پہچان کر کہا "فوراً میرے پاس پہنچو حالات نے یکایک پلٹا کھایا ہے۔ تیس منٹ کے اندر تیار ہوجاؤ.... فوراً.... تاخیر نہیں ہونی چاہئے ورنہ ...."

"تیس منٹ میں....؟" میں نے سر کو زور سے جھٹکا دے کر گزری ہوئی خوب صورت رات کے خمار کو دور کیا "شاید آپ بھول رہے ہیں میں اس وقت اسلام آباد میں نہیں بلکہ کراچی کے ساحل سے بہت دور ایک چھوٹے سے جزیرے میں ہوں۔ یہاں سے کراچی پہنچنے کے لئے پہلے کوئی لانچ بک کروانی پڑے گی۔ اس کے بعد جہاز کا سفر بشرطیکہ فوری طور پر نشست مل جائے۔"

"حکومت....؟" چیف نے غرا کر کہا "تم جہاں ہو مجھے معلوم ہے تیس منٹ میں تیار ہوکر ساحل پر پہنچ جاؤ۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رکا پھر ہلکے سے وقفے کے بعد بولا "تمہارے آنے جانے کا انتظام مسٹر زیرو نے کیا ہے۔" اس کی آواز آئی اور پھر رابطہ ختم ہوگیا۔

میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ریسیور کو دیکھا۔ ساری دنیا میں زیرو ایکس کے ایجنٹ پاکستان کے صدر کو مسٹر زیرو کے خفیہ نام سے جانتے تھے۔ میں نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا اور نادیہ کی طرف دیکھا وہ جاگ گئی تھی اور سوالیہ نگاہ سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آفس سے فون آیا تھا....؟" میں نے انگوٹھے سے فون کی طرف اشارہ کیا "مجھے فوراً واپس جانا ہوگا کمپنی نے لانچ کا انتظام کردیا ہے۔"

نادیہ پنجوانی مجھے سیکرٹ سروس کے نامور ایجنٹ شہباز کی حیثیت سے نہیں، فراز کی حیثیت سے جانتی تھی فراز ایک کروڑ پتی خوب صورت اور غیر شادی شدہ جوان تھا جو عیاشی اور دولت لٹانے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

"کیا فوری جانا ضروری ہے؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔

"ہاں میری جان...." میں فوراً بستر سے نکل آیا۔ تیس منٹ میں تیار ہوکر جزیرے کے مغربی ساحل پر پہنچنا بہت ضروری تھا "بزنس کا معاملہ ہے اور تاخیر معاملہ بگاڑ دے گی۔"

"فراز...." نادیہ نے میرا ہاتھ پکڑلیا "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" اس کی آنکھوں میں نشہ اور لہجے میں شیرینی تھی۔

ایک لمحہ کے لئے میں نے بستر پر بکھرا ہوا اس کا خوب صورت اور ہیجان خیز جسم دیکھا۔ دعوت بہت واضح تھی جسے ٹھکرانا آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی مجتمع کرکے کہا "پھر کسی وقت ڈیئر....؟" اور تولیہ سنبھال کر باتھ روم میں گھس گیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ گزرا ہوا خوب صورت دن اور ایک خواب ناک رات جو اسی کمرے میں گزری تھی ہم دونوں کی پیاس نہ بجھا سکی تھی۔

****

پندرہ دن قبل جب چیف مجھے "زیرو ایکس" کے ہیڈ آفس میں ملا تھا تو اس کے چہرے پر پریشانی کی دھول تھی اور ہاتھ میں سیاہ رنگ کی ایک موٹی فائل جس پر سنہری حروف میں ٹاپ سیکرٹ لکھا ہوا تھا۔

وہ تقریباً پانچ منٹ تک نئے مشن کی انجام دہی میں پیش آنے والے مختلف خطرات پر روشنی ڈالتا رہا پھر مطلب کی بات پر آگیا یہ اس کی خاص عادت تھی وہ اسی طرح گھما پھرا کر بات کرتا تھا۔

"شہباز! ہمیں ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ چھ گھنٹے قبل اردن کے شاہ حسین پر قاتلانہ حملہ ہوا حملہ آور نے جو مصدقہ اطلاعات کے مطابق شاہ حسین کا کالج کے زمانے کا کلاس فیلو بھی رہا ہے اور اب پارلیمنٹ کا رکن تھا ایک عجیب حرکت کی۔"

چیف سگریٹ سلگانے کی لئے رک گیا۔ میرا جذبہ تجسس جاگ اٹھا میری سوالیہ نگاہ استفہامی انداز میں چیف پر جم گئی۔

"اس نے اچانک جیب سے ریوالور نکالا اور شاہ حسین کا نشانہ لیا۔ اس وقت صرف ایک غیر ملکی سفیر وہاں پر موجود تھا۔ سات سیکنڈ تک وہ یوں ہی شاہ حسین کو نشانے پر لئے رہا۔ پھر اس نے ریوالور کا رخ اپنی طرف کیا اور خودکشی کرلی۔" چیف نے سانس لیتے ہوئے کہا اور گاڑھا دھواں اپنے حلق سے اگل دیا وہ اس طرح دھواں اگل رہا تھا گویا اس کے پیٹ میں آگ لگ گئی ہو۔

"کیا ...؟" مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ "پہلے شاہ حسین کا نشانہ لیا اور پھر خود کو گولی مارلی... یہ کیا بات ہوئی؟"

"وہاں جو غیر ملکی سفیر موجود تھا۔ اس نے اردن کے شاہ حسین کی درخواست پر اس بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔" چیف نے میرا سوال نظر انداز کردیا۔ "اردن کی حکومت کے پریس ریلیز کے مطابق اس رکن پارلیمنٹ کی موت ' ریوالور کی صفائی کے دوران ' اچانک ٹرائیگر دب جانے سے واقع ہوئی تاہم اصل معاملہ وہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔"

"مگر... مگر اردن حکومت سے ہمارا کیا تعلق...؟" میں نے مشتبہ لہجے میں کہا "پاکستانی سیکرٹ سروس کا تعلق تو صرف پاکستانی کے معاملات سے ہوتا ہے۔ ہم نے کبھی کسی ملک کے اندرونی اور داخلی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائی۔"

"پہلے پوری بات سن لو..." چیف نے برہمی کے انداز میں میز پر زور سے گھونسہ مارا۔ وہ اپنے غصے کا اظہار ہمیشہ اسی طرح کیا کرتا تھا کبھی کبھار ہاتھ زور سے میز پر پڑجاتا تو وہ تکلیف سے بلبلا کر اپنا ہاتھ سہلانے لگتا۔

میں نے اپنے ہونٹ سی لئے۔ اپنی نشست سے تھوڑا آگے جھکا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"اس قسم کے واقعات اور کئی اسلامی ممالک میں بھی ہوچکے ہیں۔" چیف نے فوراً ہی نارمل ہوتے ہوئے کہا "لوگ کسی اہم شخصیت ' سرکاری عہدے دار یا کسی وزیر کو قتل کرنے کے لئے ریوالور نکالتے ہیں اور پھر خود کو گولی مار لیتے ہیں قاتل ' مقتول بن جاتا ہے قتل کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھنے کے باوجود خودکشی کرلیتا ہے ایسے واقعات تسلسل سے ساری دنیا میں شروع ہوگئے ہیں اور... اور جانتے ہو... کچھ دیر قبل ہی مجھے پتہ چلا ہے کہ مسٹر زیرو یعنی صدر کو بھی اسی قسم کے کسی واقعے کی توقع ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس قسم کا کوئی قاتل ان کے پاس بھی پہنچ جائے اور..." چیف کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

"میں خود بھی کسی ایسے قاتل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے نفی میں اپنی گردن جھٹکی۔ میرے وجود میں دہشت کا لجلجا سانپ اتر گیا اور رگوں کے تہہ خانے میں پھنکاریں مارنے لگا۔ پھر یہ میری قوت ارادی ہی تھی جس نے اسے مار ڈالا تھا۔

زیرو ایکس کے چیف نے وہ سیاہ فائل کھولی جس پر سنہری الفاظ میں ٹاپ سیکرٹ لکھا ہوا تھا۔

"اس میں ان تمام افراد کے تفصیلی حالات زندگی موجود ہیں۔ جنہوں نے دنیا کے مختلف اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں ' اس قسم کے احمقانہ ' قاتلانہ حملے کرنے کی کوشش کی۔ اس فائل کو مکمل کرنے میں کئی ملکوں کی سیکرٹ سروسز اور انٹرپول نے ہماری مدد کی ہے تمام قاتلوں میں چند باتیں مشترک ہیں جب کہ بظاہر ان میں سے کسی کا ' ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

میں سانس روکے ' اس ناقابل یقین بات پر یقین کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ چیف چپ ہوا تو مجھ سے خاموش نہ رہا گیا میں نے پوچھ ہی لیا "اور وہ مشترکہ باتیں کیا ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ وہ لوگ کافی موٹے تھے بلکہ بہت موٹے تھے۔ دوسری بات یہ کہ سب ہی اپنے مٹاپے سے بہت پریشان تھے اور باقاعدہ علاج کرواتے تھے۔ تیسری اور آخری خاص بات یہ ہے کہ..." اس نے اپنی بائیں آنکھ معنی خیز انداز میں دبائی پھر بولا "یہ تمام افراد پنجوانی بہنوں سے بہت قریب تھے۔"

"بہت خوب..." میں نے سر ہلا کر کہا "گویا مجھے ایسے موٹے افراد کی اموات پر تحقیق کرنی ہوگی جو اپنی فربہی سے عاجز تھے اور خوب صورت لڑکیوں کے قریب رہتے تھے۔"

میرے لہجے میں ہلکا سا تیکھا پن تھا۔

"بالکل؟ چیف نے انگلیوں سے میز کی سطح بجائی۔ لیکن اس سے پہلے تمہیں پنجوانی سسٹرز کے بارے میں تفتیش کرنی ہو گی۔"

نادیہ پنجوانی سعدیہ پنجوانی اور صفیہ پنجوانی.... یہ تینوں سگی بہنیں تھیں۔ دنیا کا ہر دولت مند ان سے واقف تھا۔ ہر لکھ پتی انہیں وقتاً فوقتاً عشائیہ پر لے جاتا تھا اور ہر کروڑ پتی ان کے ساتھ راتیں گزارتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر تینوں بہنیں ہم شکل اور ہم عمر تھیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ان کی ماں طاہرہ' بنگلہ دیش سے آکر پاکستان میں بس گئی تھی۔

تینوں بہنیں کروڑ پتی تاجروں کو اپنے جال میں پھنسا لینے میں ماہر تھیں۔ دنیا کے ہر ملک میں ان کے بنگلے تھے اور ہر بینک میں ان کے چاہنے والوں نے اپنی اپنی محبت کے ثبوت میں' ان کے نام سے اکاؤنٹ کھول دیئے تھے۔

سعودیہ کے ایک عاشق صادق نے تو ایک جدید طیارہ' صفیہ پنجوانی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور اس سے شادی کی درخواست کی تھی مگر انکار کا تیشہ اس کے سر پڑا تو پاگل خانے پہنچ گیا تھا۔ لیکن طیارہ پنجوانی فیملی کی ملکیت بن چکا تھا۔ تینوں بہنیں اگرچہ کراچی میں رہتی تھیں لیکن ان کا بیشتر وقت بیرونی ممالک کی سیاحت میں گزرتا تھا۔

زیرو ایکس کی طرف سے مجھے کراچی میں بہترین بنگلہ' شاندار کار اور وافر بینک بیلنس فراہم کیا گیا۔ سیکریٹ سروس کی دولت کے بل پر عیاشی کرنا میرا فریضہ تھا۔ اس طرح میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ تین دن میں ہی پورے کراچی کی سوشل لائف کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میں سیکریٹ ایجنٹ شہباز نہ تھا۔ فراز تھا.... فراز انٹرنیشنل کمیونیکیشن کمپنی کا مالک۔ خوبصورت' جوان اور دولت مند جس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

چوتھے دن کراچی کے ایک بہترین ریسٹورنٹ کی نیم تاریک گیلری میں سے گزرتے ہوئے' نادیہ پنجوانی اچانک لڑکھڑائی اور مجھ سے ٹکرا کر گرنے کے بعد معذرت طلب کی۔ جو میں نے فوراً ہی قبول کر لی۔ ساری رات ہم کار میں' کراچی کی کشادہ اور طویل سڑکوں پر گھومتے رہے۔ پھر میں اس کے ساتھ کراچی کے ساحل سمندر سے خاصی دور "جاپانی بھٹ" کے جزیرے پر آ گیا۔

اس جزیرے پر نادیہ کی ایک خوبصورت اور کشادہ کاٹیج تھی۔ جس میں تمام جدید سہولتیں موجود تھیں۔

وہ ایک دن اور ایک رات میرے ساتھ رہی۔ ایک ایک لمحہ' ایک ایک پل ___ پھر صبح اچانک چیف کا فون آیا اور اب تین منٹ بعد میرا' جزیرے کی مغربی پٹی پر پہنچنا بہت ضروری تھا۔ میں نے جلدی جلدی تیار ہونا شروع کر دیا۔

****

ایک بڑی لانچ' جزیرے کے مغربی ساحل پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر چار افراد سوار تھے۔ انہوں نے حیرانی سے نادیہ کے الوداعی بوسے کو دیکھا جو گردو پیش سے قطعی بے نیاز تھی'

"میری بہنوں سے دور رہنا فراز' اس نے مسکرا کر کہا' وہ بھی تمہارے چکر میں ہیں"

میں کوئی جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ لانچ پر کھڑے ہوئے ایک کیپٹن نما شخص نے منہ پر ہاتھوں کا بھونپو بنا کر کہا۔ "مسٹر فراز ___ پلیز ___ ذرا جلدی کریں۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے؟

نادیہ نے مجھے اور میں نے نادیہ کو حسرت بھری نظر سے دیکھا۔ لانچ پر سوار ہونے کے بعد بھی میں ریلنگ پر جھکا اسے دور تک دیکھتا رہا۔ عین اس وقت جب کہ وہ میرے لئے ایک ہیولا بننے والی تھی۔ ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک بہت بڑی لانچ اچانک بائیں طرف سے نمودار ہوئی اور ہمارے قریب سے گزر کر ساحل کی جانب چلی گئی۔ جبکہ نادیہ اب تک ساحل پر کھڑی الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔

اس کے پاس پہنچ کر وہ لانچ ایک لمحے کو رکی۔ نادیہ نے ہاتھ ہلا کر انہیں کچھ بتایا۔ لانچ نے تیزی سے رخ بدلا اور ہماری سمت بڑھنے لگی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میرے اندر کا سیکریٹ ایجنٹ یک دم جاگ اٹھا۔

بڑی لانچ تیزی سے ہماری سمت بڑھتی آ رہی تھی۔ اس بھوکے مگرمچھ کی مانند جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ میں نے سوچا ___ کہیں نہ کہیں گڑبڑ اور غلطی ہوئی تھی لیکن کیسی گڑبڑ اور کیسی غلطی؟ میں ابھی اس بارے میں کچھ سوچ نہ

پایا تھا کہ ایک شاٹ گن میری پشت سے آ لگی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں غلط لانچ میں بیٹھ گیا تھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی میں سکتے میں آ گیا۔

"مسٹر فراز ۔۔۔۔" کیپٹن نما شخص نے سفاک لہجے میں کہا۔ "ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا' ورنہ بھون دیئے جاؤ گے؟" آواز کی کرختگی بتا رہی تھی کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔

مجھ پر اب تک حیرت کی برف گر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ کون تھے؟ مجھے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے اور انہیں میرے جزیرہ چھوڑنے کی اطلاع کیسے مل گئی تھی؟ میں اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھا کہ لگا کہ اس کا ایک ساتھی زور سے چلایا۔ لانچ کو ایک خوفناک جھٹکا لگا اور ہم دونوں اپنا توازن کھو کر' دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ شاید پچھلی لانچ والوں نے ٹارپیڈو فائر کر دیا تھا۔

شاٹ گن اس شخص کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی اور چوبی فرش پر پھسلتی ہوئی گہرے نیلے پانی میں غائب ہو گئی۔

غفلت کا یہ ایک مختصر سا لمحہ میرے لئے بہت کافی تھا۔ میں اسے گنوا دیتا تو یہ میری حماقت ہوتی۔ اس کے سنبھلنے سے قبل میرے جوتے کی ٹھوکر' پہلے اس کے پیٹ اور پھر منہ پر پڑی۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور حلق کے بل چیختا ہوا لمبا لیٹ گیا۔

اس کی چیخ اس کے ساتھی کو ہوشیار کر گئی! جو مجھ سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ کیپٹن نما شخص کا ساتھی میری جانب جھپٹتا میں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ پانی برف کی طرح سرد تھا۔

****

میرے سمندر میں کودتے ہی لانچ کے دوسرے آدمیوں نے مجھ پر گولیوں کی بوچھار کر دی لیکن ان کا یہ اقدام بعد از وقت تھا۔

میں نے پانی میں گہرا غوطہ لگایا اور دور تک نیچے ہی نیچے تیرتا چلا گیا۔ ہر سیکرٹ ایجنٹ کی طرح میں بھی دیر تک سانس روکنے اور تیرنے میں ماہر تھا۔ جب میرے پھیپھڑے' آکسیجن کی کمی کا شکار ہو کر احتجاج کرنے لگے تو میں نے سانس لینے کے لئے منہ باہر نکالا۔ پچھلی لانچ کافی قریب آ چکی تھی۔ اسی وقت مجھے پانی میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہوئی۔

میرا ذہن فوراً حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ شاید دوسرا تارپیڈو فائر کر دیا گیا تھا۔ نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پلک جھپکتے میں اس لانچ کے پرخچے اڑ گئے۔ جس میں سے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔ لکڑی کے تختے اور آدمیوں کے ٹکڑے' کئی فٹ' بلندی تک اچھلے اور دیکھتے ہی دیکھتے اونچی نیچی لہروں کے پیٹ میں پہنچ گئے۔ ایک شخص کا نچلا دھڑ تو میرے بالکل قریب آ کر گرا تھا۔ اس کا اوپری دھڑ کہاں گیا؟ اس بارے میں وثوق سے کہنا مشکل تھا۔ تاہم اغلب گمان یہی تھا کہ وہ بھی سمندر کے گہرے پانی میں ڈوب گیا ہوگا۔ اگر میں اس لانچ میں رہتا تو میرا حال بھی یہی ہوتا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی۔

میں تیرتا ہوا دوسری لانچ کے بالکل قریب چلا گیا۔ لانچ کے کیپٹن نے مجھے سہارا دے کر اوپر کھینچ لیا۔ عرشے پر پہنچتے ہی میں لمبا لیٹ گیا۔ میری سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

"سوری ۔۔۔۔" وہ معذرت چاہنے والے انداز میں بولا۔ "ہمیں ذرا سی دیر ہو گئی اور تم غلط لانچ میں چڑھ بیٹھے۔"

"کوئی بات نہیں ۔۔۔۔" میں جھینپ سا گیا تھا۔ "آنکھ رکھنے والے پرندے سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اب ہم جلد ہی کیماڑی پہنچ جائیں گے لیکن لانچ کا رخ کیماڑی کی جانب نہ تھا بلکہ وہ گہرے سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس کا احساس فوراً ہی ہو گیا۔ میرا ذہن بیدار تھا۔

"تم کس طرف جا رہے ہو؟" میں نے تیز رفتار لانچ کے کیپٹن سے پوچھا۔ "اس طرف تو تقریباً ایک ہزار میل تک سمندر ہے۔"

"گھبراؤ نہیں ۔۔۔۔" ادھیڑ عمر کیپٹن نے مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی۔ "ہم وہی کر رہے ہیں۔ جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔"

اس کے لہجے میں مکاری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں

خاموش ہو گیا اور نیلے پانی کو بے مقصد انداز میں گھورنے لگا۔ پندرہ منٹ تک میں ریلنگ سے لگا کھڑا رہا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں درست لانچ میں ہوں۔ میرے اعصاب کشیدہ تھے اور تشکیک کے بھالے میرا جسم چھید رہے تھے۔ سولھویں منٹ پر سمندر کے وسط میں ایک طیارہ بردار جہاز کھڑا نظر آیا۔

وہ سمندر میں یوں بے حرکت کھڑا تھا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ عملے نے لانچ کا رخ جہاز کی سمت کر دیا۔ اس کی رفتار میں اب بھی کمی نہیں آئی تھی۔ جلد ہی لانچ اس دیو ہیکل جہاز کے قریب پہنچ گئی۔

دس منٹ بعد میں فضا کے دوش پر سوار اسلام آباد کی طرف جا رہا تھا۔

****

ایئرپورٹ سے باہر نکلا تو "زیرو ایکس" کا چیف ایک شیورلیٹ کار میں بیٹھا نظر آیا۔ میں نے اس کی کار دیکھی تو سیدھا اس کی سمت بڑھ گیا۔ اس کی نگاہ اس وقت تک مجھ پر نہ پڑی جب تک میں اس کے بالکل قریب نہ پہنچ گیا۔ وہ ڈرائیونگ نشست پر بیٹھا تھا اور اضطراری انداز میں مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں دوسری جانب کا دروازہ کھولتے ہوئے ہلکی سی آواز میں کھنکارا۔

"اوہ! تم آ گئے ....." وہ خفیف سا ہو کر میری جانب مڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا۔ اس نے مجھ سے میرے مشن کی رپورٹ طلب کر لی۔

"رپورٹ ......؟ کیسی رپورٹ؟" میں نے کہا "پنجوانی سسٹرز پر خواہ مخواہ شک کیا جا رہا ہے وہ معزز اور ...."

"کافی متاثر معلوم ہوتے ہو ان سے ......" چیف نے میری بات کاٹ دی اور تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اس نے جس بے رحم انداز میں پنجوانی سسٹرز پر تبصرہ کیا تھا۔ وہ مجھے ناگوار گزرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ہیڈ کوارٹر لے جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ کار کافی دیر تک وہیں کھڑی رہی تو میں نے سوالیہ انداز میں چیف کی طرف دیکھا۔

"آج ایران کے وزیر خارجہ اپنے وفد کے ہمراہ آ رہے ہیں۔" اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگا لیا۔

"اسلام آباد میں یہ وفد صرف دو گھنٹے ٹھہرے گا۔ صدر اور وزیر اعظم سے اہم مذاکرات کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ اس وفد کے ہر فرد کی حفاظت کی ذمے داری ہم پر ہے۔ ایران کا وزیر خارجہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ انہیں کچھ ہو گیا تو نہ صرف برادرانہ تعلقات کشیدہ ہوں گے بلکہ ملک فرقہ وارانہ طوفان کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ جس سے نمٹنا آسان نہ ہو گا۔"

میں یہ اطلاع سننے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد ایرانی ایئرفورس کے دیو ہیکل ٹریوجیٹ کا دروازہ کھلا اور فلیش کے جھماکوں کے درمیان 'ایران کے وزیر خارجہ اپنے وفد کے ہمراہ برآمد ہوئے۔ ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج تک چیف میں اور زیرو ایکس کے درجنوں ایجنٹ انہیں غیر محسوس انداز میں اپنے گھیرے میں لئے رہے۔ مقصد یہی تھا کہ کوئی غیر متعلقہ شخص ان کے نزدیک نہ آنے پائے۔

وی آئی پی لاؤنج میں ایک لمبی میز کے ایک طرف پاکستانی حکومت کے صدر اور وزیر اعظم اپنے گیارہ نمائندوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کہ دوسری جانب ایرانی وفد براجمان تھا۔ ان کا اہم موضوع یہی تھا کہ یہ لوگ جو دنیا بھر میں کلیدی عہدوں پر فائز شخصیتوں کو مارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور حیرت انگیز طور پر خود کشی کر رہے ہیں۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ سارا ڈرامہ کس نے شروع کر رکھا ہے؟

تشویش کی بات یہ تھی کہ ایران میں بھی اس قسم کے دو واقعات ہو چکے تھے۔ لیکن انہیں نہایت ہوشیاری سے دوسرا رنگ دے دیا گیا تھا۔ ایرانی وزیر خارجہ جاننا چاہتے تھے کہ اس بارے میں پاکستان کی معلومات کتنی ہیں؟

صدر اور وزیر اعظم نے اس سلسلے میں اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ دونوں ملکوں کے مابین ہونے والے تجارتی 'اقتصادی اور ثقافتی امور کی جانب ہو گیا۔ کشمیر کا ذکر آیا تو ایران کے وزیر خارجہ نے بھرپور انداز میں پاکستانی مؤقف کی حمایت کی۔ ایرانی وفد فضا میں پرواز کر گیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی لیکن چیف نے بتایا کہ ابھی

ہم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے کیونکہ بھارت کا ایک اعلیٰ اختیاراتی وفد ایک روزہ دورے پر پاکستان آرہا ہے۔ اس وفد کی حفاظت کی ذمے داری بھی ہم پر ہے۔

صدر اور وزیراعظم اپنے وفد کے ہمراہ، وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ جب کہ میں چیف کے ساتھ باہر آگیا۔ اب ہمیں بھارتی وفد کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ تمام انتظامات مکمل تھے۔ ہر ناگہانی خطرے سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرلی گئی تھیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل تشویش ناک انداز میں دھڑک رہا تھا۔

بھارت جتنا بڑا ملک ہے۔ اتنا ہی بڑا اس کا طیارہ تھا۔ وہ مخصوص جگہ رکا تو طیارے کا دروازہ کھلا اور فلیش کے جھماکوں کے درمیان، بھارتی وفد کی قیادت کرنے والا شخص نمودار ہوا۔ جو اندرا کانگریس کا انتہائی اہم عہدے دار تھا۔ وفد کے دوسرے افراد وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وفد کل دس افراد پر مشتمل تھا۔ ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج تک، اس وفد کو بھی ہم نے غیر محسوس گھیرے میں رکھ کر پہنچا دیا۔

"پاکستانیو..." اندرا کانگریس پارٹی کے اہم عہدے دار نے تمام سفارتی آداب بالائے طاق رکھ دیئے اور مخالف سمت میں بیٹھتے ہی چلایا۔ "تم نے دنیا بھر میں یہ کیا چکر چلا رکھا ہے؟ یہ لوگ جو دنیا میں عموماً اور بھارت میں خصوصاً اہم عہدے داروں کو مارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور حیرت انگیز طور پر خودکشی کر رہے ہیں یہ سارا ڈراما آخر تم لوگوں نے کیوں شروع کیا ہے؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طریقے سے مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر اٹھایا جا سکتا ہے اور بھارت پر دباؤ ڈالوایا جا سکتا ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔"

"بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔" وزیراعظم نے تنک کر کہا۔ "ہمیں یقین ہے کہ یہ سب بھارتی حکومت کی ایما پر ہو رہا ہے۔ تاکہ وہ اس الزام کو بنیاد بنا کر، پاکستان کو بین الاقوامی دہشت گرد قرار دلا سکے۔"

"بکواس......" اندرا کانگریس پارٹی کے اہم عہدے دار کے ساتھ آنے والے ایک شخص نے اپنے چیف کی حمایت کی۔

"یہ سب کچھ پاکستانی حکومت کرا رہی ہے۔ تاکہ دنیا بھر کے لوگوں کی توجہ کشمیر کی طرف ہو جائے۔ حالانکہ یہ مسئلہ برسوں ہوئے مردہ ہو چکا ہے۔ اب اس موضوع پر بھارت بات تک کرنا نہیں چاہتا۔"

بھارتی سفیر بھی سارے سفارتی آداب بھلا کر اونچی آواز میں اپنے ساتھیوں کی حمایت کر رہا تھا۔

صدر اور وزیراعظم خاموش ہو گئے تھے۔ غصے سے ان کے چہرے تمتما رہے تھے لیکن میزبانی کے آداب کے پیش نظر وہ خاموش تھے۔ البتہ ان کی جگہ ان کے ساتھی بول رہے تھے اور خوب بول رہے تھے کسی کو یہ خوف نہ تھا کہ بھارت بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی جنگی استعداد بھی بہت زیادہ ہے اور وہ اس تلخی کو بنیاد بنا کر پاکستان پر لشکر کشی کر سکتا ہے۔

پندرہ منٹ تک دونوں جانب سے تلخ و تند جملوں کے تبادلے ہوتے رہے۔ وہ مسلسل میز پر گھونسے مار مار کر اور چیخ چیخ کر بولتے ہوئے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اس کوشش میں منہ سے جھاگ نکالتے رہے۔

بیس منٹ پورے ہوئے تو ان کے لہجے میں ندامت آگئی۔ تیس منٹ ختم ہوئے تو یہ ثابت ہو چکا تھا کہ خودکشی کی ان وارداتوں کے پس منظر میں نہ پاکستان ہے اور نہ ہی بھارت۔ چالیس منٹ بعد پاکستانی صدر اور آئی کانگریس پارٹی کے اعلیٰ عہدے دار نے مسکرا کر ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے اور باتیں کرنے لگے۔

آئی کانگریس پارٹی کا یہ اہم عہدے دار لاہور میں پیدا ہوا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جنم بھومی دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ صدر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی خواہش کو فوری طور پر پورا کر دیں گے اور اس سلسلے میں کوئی قباحت پیش نہیں آئے گی۔

بھارتی وفد کے باقی لوگ اپنے سامنے بیٹھے افراد سے گفتگو کرنے لگے۔ وہ دھیمے، شائستہ اور مہذب انداز میں بول رہے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ذرا دیر پہلے یہاں

لفظوں کی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔

****

بھارتی سفیر اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اندرا کانگریس پارٹی کے چیف نے اسے تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بھارتی سفیر نے یکایک اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گرینیڈ نکال لیا۔ دانتوں میں اس کی پن دبا کر اس نے ایک جھٹکے سے نکالی اور گرینیڈ کو فرش پر پھینک دیا۔

خوف کا ایک لمحہ دبے پاؤں آیا اور پورے لاؤنج پر چھا گیا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ مجھے اپنے ہی دل کی دھڑکنوں سے ڈر لگنے لگا۔ بھارتی وفد کے چیف نے خوف اور بے بسی کے ملے جلے جذبے سے فرش پر پڑے گرینیڈ کو دیکھا۔ موت اچانک اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگی۔ صدر کی حالت بھی غیر تھی۔ دونوں نے بھاگنا چاہا لیکن خوف کی زنجیر نے انہیں مفلوج کر دیا تھا۔ لاؤنج میں موجود لوگ بھی اپنی اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

بھارتی سفیر نے بے جان نظروں سے پورے لاؤنج کا ایک جائزہ لیا اور گرینیڈ پر گر گیا۔

فوراً ہی ایک اعصاب شکن دھماکہ ہوا۔ گرینیڈ پر پڑے ہوئے بھارتی سفیر کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور پلک جھپکتے میں اس کے پورے بدن کے پرخچے اڑ گئے۔ گوشت اور اعضا کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے جو دیواروں سے جا چپکے تھے اور خون کی بارش تھی جو وہاں موجود ہر شخص کے لباس پر نقش و نگار بنا گئی تھی۔

صدر اور وزیر اعظم سمیت سب لوگ ساکت و جامد بیٹھے یا کھڑے ہوئے تھے۔ بھارتی وفد کے چیف کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ـــــ" میں نے سوچا۔ پہلے اس نے گرینیڈ فرش پر پھینکا اور پھر خود ہی اس پر گر گیا۔ گویا صدر کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ پاکستان میں بھی اس قسم کے واقعات کی ابتداء ہو گئی تھی ـ"

زیرو ایکس کے ایجنٹوں نے بھارت اور پاکستان کے وفود کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ ایک ایک کر کے وہ سب باہر نکل گئے۔ دہشت زدہ چہرے اور ڈھلکے ہوئے شانے لئے وہ مرنے سے بال بال بچے تھے۔ موت ان کے قریب سے ہو کر نکل گئی تھی۔ ایسے میں ان کی یہ دہشت فطری تھی۔ چیف اور میں وہاں کھڑے رہ گئے۔ فرش پر بھارتی سفیر کی لاش کے ٹکڑے پڑے تھے۔

میرے نزدیک یہ ایک اچھی بات تھی کہ جو کچھ ہوا' بھارتی وفد کے سامنے ہوا۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں سفیر یہ حرکت کرتا تو شاید بھارتی حکومت کو یقین دلانا مشکل ہو جاتا کہ اس میں پاکستان کا ہاتھ نہیں ہے۔ اسے تو بہانہ درکار تھا۔ وہ یقیناً بھارتی سفیر کی موت کو دنیا میں اچھالتا اور پاکستان کو بین الاقوامی دہشت گرد ملک قرار دلوا دیتا۔

رات کے تین بجے جب میں اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا اور اس واقعے پر غور کر رہا تھا۔ چیف نے فون پر مجھے بتایا؟ بھارتی سفیر پنچوانی سسٹرز سے اچھی طرح واقف تھا۔ پرسوں رات ہی وہ سعدیہ پنچوانی کی پارٹی میں شریک ہوا تھا۔"

"پھر پنچوانی سسٹرز......" میں نے بمشکل اپنے اندر اٹھنے والے غصے کی لہر کو دبایا۔ "آخر آپ پنچوانی سسٹرز کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ میں غصے پر تو قابو پا گیا تھا لیکن لہجے کی جھنجلاہٹ پر میرا اختیار نہ رہا تھا۔

"بات سنو......" چیف زور سے دھاڑا۔ شاید اسے میرا انداز تخاطب ناگوار گزرا تھا۔ "کل صبح ایجنٹ سجاد تم سے رابطہ قائم کرے گا۔ وہ بھی اس پارٹی میں شریک تھا۔ پارٹی کے بارے میں تفصیل وہی بتائے گا۔"

"مگر اس سارے بکھیڑے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے دبے الفاظ میں کہا۔ "خطرہ ابھی ہم تک تو نہیں پہنچا ہے۔"

"تم کچھ بھی کہو......" دوسری جانب سے چیف نے کہا۔ "جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں پنچوانی سسٹرز کا اس بین الاقوامی سازش سے تعلق ضرور ہے۔ تمہیں اسی تعلق کا پتہ لگانا ہو گا۔ اگرچہ کام خاصا مشکل ہے مگر مجھے تمہاری صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے۔ ماضی میں تم اس سے بھی زیادہ مشکل مہمات انجام دے چکے ہو۔"

رابطہ منقطع ہوا تو ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر میں سو گیا۔

رات کے تین بجے اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

****

مجھے بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یکایک ایک ہلکی سی آہٹ مجھے سنائی دی۔

میں نے چاروں طرف نگاہ گھمائی۔ کھڑکی کے ذریعہ ایک سیاہ نقاب پوش اندر آ چکا تھا۔ اس کا لباس بھی سیاہ تھا جو بدن سے چپک رہا تھا۔ ہلکے نیلے بلب کی روشنی میں، میں نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا آٹومیٹک ریوالور تھا۔

اس سے پہلے کہ میں تکئے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکالتا۔ وہ یک دم آگے بڑھ آیا اور ریوالور میری پیشانی پر رکھ دیا۔

موت کو خود سے اتنے قریب پا کر میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا اور خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ جب ریوالور کی سرد نال آدمی کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہو تو ایسے میں کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے پھرتی سے کروٹ بدل کر بستر سے نیچے گرنا چاہا لیکن ناکام رہا میرے جسم کا ہر عضو جیسے شل ہو کر رہ گیا تھا۔

اب مجھے گولی چلنے کا انتظار تھا۔ اس گولی کا جو میری پیشانی پر تیسری آنکھ بنانے کے لئے چلائی جانے والی تھی۔ مجھے اپنا ہر سانس آخری سانس لگ رہا تھا۔ رات کے ساڑھے تین بجے یوں اچانک کھڑکی کے راستے، خواب گاہ میں گھس آنے اور ریوالور پیشانی پر رکھ دینے والے کو دوست تو نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ فرشتہ اجل بن کر آیا تھا اور یقیناً مجھے ہلاک کرنے کے بعد ہی وہ اس کمرے سے نکلتا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن نقاب پوش ہونے کے باعث میں اسے پہچان سکتا تھا نہ ہی اس کے چہرے کا تاثر دیکھ سکتا تھا۔ دل کی ہر دھڑکن میرے کانوں میں ڈھول کی آواز بن کر گونج رہی تھی۔

آنکھوں کی جگہ اس کے نقاب میں دو سوراخ تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے جان اور پتھرائی ہوئی تھیں۔

چند ثانئے تک اس کا ریوالور میری پیشانی پر اپنا لمس چھوڑتا رہا اور خوف و دہشت کی لہریں میری رگ و پے میں دوڑاتا رہا۔

میں بے بس چوہے کی مانند شکنجے میں پھنسا ہوا تھا اور اب بھی اپنے قاتل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

یکایک ریوالور میری پیشانی سے ہٹ گیا۔ نقاب پوش نے اسے اپنی کنپٹی پر رکھ لیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک سنہری موقع تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے اٹھ سکتا۔ ایک ہاکا سا دھماکا ہوا اور اس نقاب پوش کی کنپٹی پر ایک گول سوراخ نمودار ہو گیا۔ جس سے جیتا جاگتا خون ابل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے تمام مواقع میسر ہونے کے باوجود مجھے چھوڑ دیا اور اپنا کام تمام کر لیا۔

گولی اس کی کھوپڑی پھاڑتی، بھیجہ چاٹتی دوسری جانب نکل گئی تھی۔ وہ چند ثانئے تک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتا رہا۔ پھر ہچکی لے کر لڑکھڑایا اور زمین پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی میں بستر سے اٹھا اور چھلانگ لگا کر اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اب کسی بھی قسم کی طبی امداد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ لیکن ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

میں نے اس کا نقاب ہٹا کر دیکھا تو مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ بھارتی وفد کا نمائندہ تھا۔ اس وفد کا ایک نمائندہ جو دن میں آیا تھا اور مذاکراتی دور میں بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اسے مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ اور اسے میرا پتہ کس نے دیا تھا؟ فوری طور پر میں نے زیرو ایکس کے چیف کو فون کیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

اس رات میں تھوڑی دیر کے لئے بھی نہ سو پایا۔ کیونکہ نصف گھنٹہ بعد ہی بھارتی وفد کا قائد اور زیرو ایکس کا چیف اپنے کئی ماتحتوں کے ساتھ میرے کمرے میں موجود تھا۔ بھارتی وفد کے قائد نے میری زبانی سارا واقعہ تفصیل سے سنا۔ میں خاموش ہوا تو اس کے چہرے پر تشویش کی سیاہی بتا رہی تھی کہ اسے اس واقعے کو اپنی سچائی کے ساتھ ہضم کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے اس نے سرکاری طور پر درخواست کی کہ اس واقعہ کو دوسرا رنگ دے دیا جائے۔

آدمی اور پولیس

بس اسٹاپ پر بڑی بھیڑ تھی۔ بس آئی تو وہ بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا اور بولا۔
"صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے۔ صرف ایک آدمی۔"
یہ سن کر ایک پولیس والا جھٹ سے بس میں سوار ہوگیا اس کے پیچھے ایک وکیل صاحب بھی چڑھنے لگے تو کنڈیکٹر چلا کر بولا۔
"دیکھیں! دیکھیں۔ آپ نے سنا نہیں میں نے کہا تھا صرف ایک آدمی اندر آسکتا ہے۔"
وکیل صاحب بڑی معصومیت سے بولے۔
"وہ تو پولیس والا ہے . . ."

جسے قبول کرلیا گیا۔

زیرو ایکس کے چیف کے حکم پر لاش وہاں سے ہٹادی گئی۔ پھر وہ لوگ بھی چلے گئے۔ اب میں کمرے میں اکیلا تھا۔ خواب گاہ سے وہ قالین بھی ہٹادیا گیا تھا۔ جس پر بھارتی وفد کے نمائندے کا خون گرا تھا۔ خالی جگہ مجھے یاد دلا رہی تھی کہ یہاں ذرا دیر قبل کچھ ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ صبح کا اجالا غیر محسوس انداز میں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ایجنٹ سجاد مجھ سے ملنے چلا آیا۔ وہ اتنے انکسار سے بولتا تھا کہ اس کی سیکرٹ ایجنٹ ہونے پر شبہ گزرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب سی مسکینی برستی رہتی تھی۔ جب کہ اس کا وزن کسی طرح بھی تین سو پونڈ سے کم نہیں تھا۔ میں نے اسے چائے پیش کی۔ جس کو اس نے بخوشی قبول کرلیا۔

"جناب! پارٹی میں دو اداکار، ایک صحافی اور ایک گلوکارہ تھی۔ آنجہانی بھارتی سفیر تھے اور تقریباً ایک درجن نامانوس چہرے تھے۔ اس نے چائے کی خالی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے بتایا۔ "یہ پارٹی رات دیر گئے تک جاری رہی تھی۔ سعدیہ بلاشبہ ایک اچھی میزبان ہے۔"

"پوری پارٹی کے دوران کیا سعدیہ پنجوانی اور بھارتی سفیر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی علیحدہ گوشے میں جاکر کھڑے ہوئے تھے؟" میں نے دریافت کیا اور سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔

"جی نہیں ـــ" اس نے نفی میں گردن جھٹک دی۔ "ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔"

مجھ پر ہلکی سی مایوسی طاری ہوگئی۔ اس کا جواب میری توقع کے خلاف تھا۔

"کیوں نہ زیرو ایکس کی مخصوص اور جدید ترین لیبارٹری میں بھارتی سفیر کی کھوپڑی میں سے دماغ نکلوا کر اس کا معائنہ کروالیا جائے۔" میں نے کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد کہا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوگا جناب ـــ؟" اس نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔ میرے ذہن میں جو خیال اچانک ابھرا تھا۔ اور جس کے تحت میں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

"اب تک اس قسم کے جتنے بھی واقعات ہوئے ہیں۔ ان میں لوگوں نے انتہائی عجیب رویئے کا اظہار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ بھارتی سفیر کا بھی شاید یکایک دماغ خراب ہوگیا ہو۔ جس کے زیراثر اس نے پہلے گرینیڈ پھینکا۔ غالباً صدر پاکستان یا اپنے وفد کے قائد کو قتل کرنے کے لئے اور پھر خود اس پر گر گیا۔" مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی پڑی۔

"تم نے دیکھا تھا۔" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے چہرے پر موت سے قبل ایک عجیب سا تاثر تھا۔ یوں جیسے وہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر ہو۔" میرے لہجے میں خود بخود جھلاہٹ سی در آئی۔ ایجنٹ سجاد ہر بات کو گھوم پھر کر سمجھنے کا عادی تھا۔

"جادو جناب ـــ" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ "یقیناً۔ ایسے لوگوں پر پہلے سے جادو کردیا جاتا ہوگا۔"

"نہیں ـــ" میں نے زور سے کہا۔ "شاید ہپناٹزم...... یا شاید کوئی نشہ آور دوا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی برین

مہمان اور بھوکا شیر

حضرت ابراہیمؒ ادھم اپنے حج کے سفر کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں بیتُ اللہ شریف کی طرف حج کے لیے جا رہا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، مجھے سخت سردی لگی۔ سامنے ایک پہاڑ تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں اُس کی غار میں چلا گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک شیر آگیا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "تُو کون ہے؟ اور یہاں میرے مکان میں میرے اِذن کے بغیر کیوں چلا آیا ہے۔"

مَیں نے اس سے کہا۔ "مَیں ایک کمزور اور بے وطن انسان ہوں۔ آج رات تیرے پاس تیرا مہمان ہو کر آیا ہوں۔"

جب اُس نے میری یہ بات سُنی تو وہ ایک طرف ہو کر سو رہا اور مَیں صبح تک جاگتا رہا اور قرآن شریف پڑھتا رہا۔ جب صبح کو مَیں نے وہاں سے کوچ کا ارادہ کیا تو شیر نے کہا۔ "اے ابراہیم تعجب نہ کرنا کہ آج رات میں شیر کے پاس سویا تھا اور میں اُس سے بچ گیا۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی مَیں تین دنوں سے بھوکا ہوں۔ اگر تو میرا مہمان نہ ہوتا تو مَیں تجھ کو ضرور کھا لیتا۔"

مَیں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور وہاں سے اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

نیاز احمد نیازی، بہاول نگر

واشنگ کردی گئی ہو" سجاد کی پہلی والی رائے بدل گئی۔

"جی ہاں..... ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے زور سے اثبات میں سر ہلایا "غالباً آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"میں فی الوقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم یہاں سے جاتے ہی چیف کو میری رائے سے آگاہ کر دینا کہ بھارتی سفیر کے دماغ کا معائنہ ضرور کروایا جائے۔"

جانے سے قبل سجاد نے مجھے جھک کر تعظیم دی اور رخصت ہو گیا۔

—●—

فراز بن کر میں نے رات کے نو بجے سعدیہ پنجوانی کے لگژری فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو خود سعدیہ نے دروازہ کھولا۔

میں اسے دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ وہ واقعی نادیہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی۔ دونوں بہنیں ساتھ کھڑی ہو جاتیں تو انہیں یقین سے پہچاننا مشکل تھا۔ تیسری بہن صفیہ پنجوانی کو میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا اس کے بارے میں کچھ کہنا دشوار تھا۔

"اوہ..... فراز تم....." اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک سریلی چیخ ماری۔ "کہاں تھے اتنے دنوں سے؟" وہ ہلکے گلابی جوڑے میں ملبوس تھی اور کسی انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔

خاصی جدوجہد کے بعد میں نے نظریں اس کے چہرے پر جمائیں اور مسکرا دیا۔ اس نے آنکھ کی جنبش سے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی پیچھے چلتے ہوئے۔ میں اس کے خوب صورت اور متناسب جسم کو دیکھتا رہا۔ وہ یوں چل رہی تھی کہ رقص کا گمان ہوتا تھا۔

"میں نے سنا ہے، تم نادیہ کے ساتھ تھے۔ کراچی سے دور، کسی جزیرے پر....." اس نے صوفہ پر میرے بے حد قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہ درست ہے" میں نے تردید مناسب نہ سمجھی۔ یقیناً نادیہ نے اسے بتا دیا ہو گا میرے بارے میں۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ پھر سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "تم سعدیہ ہی ہو نا؟" مجھے اب تک اس پر نادیہ کا گمان گزرتا رہا تھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی تو اس کے گالوں میں ایک نازک سا گڑھا پیدا ہو گیا۔ بالکل اس کی بہن نادیہ کی طرح۔

"ہاں!" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا نام سعدیہ ہے مگر تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟ کیا تمہیں میرے سعدیہ ہونے پر شبہ ہے؟"

اس نے مجھے خاصی مشکل میں ڈال دیا تھا لیکن جواب تو دینا ہی تھا۔ دراصل صورتوں کی حد درجہ مماثلت اور قامت و شباہت میں ایسی حیران کن یکسانیت ـــــ میرا مطلب ہے گڑبڑ ہو سکتی ہے شناخت کرنے میں۔"

"ہماری تیسری بہن صفیہ کو نہیں دیکھا تم نے ـــــ؟" وہ شیریں آواز میں شوخی سے بولی۔ سب سے شرارتی ہے وہ۔ ویسے بھی اگر ہم تینوں کو ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی شخص ہمارے نام درست نہیں بتا سکتا۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔

رام سنہا کی بات کر رہے ہو تم؟" اُس نے پوچھا۔ "سنا ہے بے چارہ اپنی رائفل صاف کرتے ہوئے اتفاقاً ٹریگر دب جانے سے ہلاک ہو گیا ـــــ اچھا آدمی تھا۔" اس کے لہجے میں تاسف در آیا تھا۔

"سنا ہے! وہ یہاں اکثر آتا رہتا تھا؟" میں نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "صرف تم سے ملنے کے لئے۔"

"ہاں! یہ غلط نہیں ہے۔ پرسوں پارٹی میں بھی آیا تھا ہمارے گھر ـــــ اس کی آنکھوں میں پیاس تھی۔ اب چھوڑو اس کا ذکر ـــــ اور ادھر آؤ میرے پاس ـــــ" نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ جانتی ہی نہیں یا بتانا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے بیڈ روم میں صرف ایک ڈبل بیڈ تھا اور تمام دیواروں پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ ذرا دیر بعد ہی دیوار کے شیشوں میں کئی بدن، آپس میں الجھ رہے تھے ان میں سے کون سا عکس اصلی تھا یہ شناخت کرنا دشوار تھا۔

****

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی موسیقی گونج رہی تھی۔

سعدیہ بستر سے غائب تھی اور باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز کے ساتھ اس کی مترنم گنگناہٹ بھی سنائی دے رہی تھی میں بستر سے اٹھ گیا۔ میز پر شیمپین کی بوتل پڑی مسکرا رہی تھی میں نے ایک جام بھرا اور دوبارہ بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

" فراز ـــــ" باتھ روم سے اس کی آواز آئی۔ "کیا تم جاگ گئے ہو؟"

"ہاں" میں نے کہا اور جام کو میز پر رکھ دیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں سے ایک ہلکی آواز آئی جیسے کوئی خفیف انداز میں حرکت کر رہا ہو ۔ میں نے اپنی سماعت کا واہمہ جان کر نظرانداز کر دیا اور جانے کس جذبے کے زیر اثر اپنی گردن پر ہاتھ رکھ لئے۔

اسی وقت آہنی تار کا ایک باریک پھندا مضبوطی سے میری گردن میں فٹ ہو گیا اگر میرے ہاتھ میری گردن پر نہ ہوتے تو شاید میں اگلے ساٹھ سیکنڈ میں مرحوم ہو جاتا۔ زندگی کے اجالے میرا ساتھ چھوڑ جاتے اور میں موت کی اندھی وادی میں بھٹکتا پھرتا۔

میں نے گردن موڑ کر اس شخص کو دیکھنا چاہا جو مجھ پر حملہ آور ہوا تھا لیکن ناکام رہا۔

اجنبی ہاتھوں نے زور لگا کر پھندا کسنا شروع کر دیا۔ لوہے کا باریک تار میرے ہاتھوں کی جلد کاٹے ڈال رہا تھا اور میرے نرخرے پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ معاً میری نظر سامنے دیوار کے شیشے پر پڑی۔ میرے عقب میں ایک موٹا سا شخص کھڑا تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے اپنی بینائی پر یقین نہ آیا۔ میں ایک ہی ثانیہ میں پہچان گیا وہ زیرو ایکس کا سینئر ایجنٹ سجاد تھا جو اکثر اپنے مٹاپے سے عاجز رہنے کی شکایت کرتا رہتا تھا لیکن اس وقت اپنی تمام تر فربہی کے باوجود وہ نہایت پھرتی دکھا رہا تھا۔

" سجاد ـــــ تم ـــــ" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا۔ میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونک پڑا۔

ایک لمحے کے لئے پھندے پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی میں نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور تڑپ کر اس پر جا گرا۔ پھندا اب مزید ڈھیلا پڑ گیا تھا کیونکہ اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک پر جم گیا تھا جہاں پر میرا زوردار گھونسہ پڑا تھا۔

میرا دوسرا گھونسہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ غیر متوازن ہو کر

پیچھے ہٹا تو میں نے ایک جھٹکا دے کر لوہے کا تار اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ اب تار اس کے ہاتھ نہیں، میرے ہاتھ میں تھا۔ میں چاہتا تو جو سلوک اس نے میرے ساتھ کیا تھا وہی میں اس کے ساتھ کر سکتا تھا لیکن میں نے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔

"یہ کیا حماقت ہے سجاد؟" میں نے محتاط انداز میں باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

سجاد کے چہرے پر ایک عجیب سی سفاک چمک تھی مجھے اس کا کرخت چہرہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ وہاں مسکینی کی جھلک تک نہ تھی جو اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر غرا کر مجھ پر حملہ آور ہوا اس کے ہاتھ میں خنجر کی چمک واضح تھی۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور خنجر کا چمکدار پھل مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ زیرو ایکس کا بہت پرانا ایجنٹ تھا۔ وفادار اور قابل اعتماد ایجنٹ۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں خلاء میں کسی نامعلوم نقطے کو گھور رہی تھیں اور ہمیشہ مسکین نظر آنے والے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر بے ساختہ بھارتی سفیر کا چہرہ یاد آ گیا۔ بے جان، بے حس اور سپاٹ۔

اس نے ایک مرتبہ پھر جھپٹ کر مجھ پر حملہ کیا وہ خنجر کی نوک سے میرا حلقوم ادھیڑ دینا چاہتا تھا لیکن میں جھکائی دے کر خود کو بچا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

****

یکایک مجھے احساس ہوا کہ اب مجھے اسے قتل کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ہر صورت میں مجھے ختم کر دینے پر تلا ہوا تھا۔

تیسری مرتبہ خنجر میرے چہرے سے صرف ایک انچ کے فاصلہ سے آواز کرتا گزرا تو میں تیار تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے خنجر والے ہاتھ پر پڑا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلایا اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ تاہم خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور موت کی آنکھ بن کر مجھے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا میں نے دائیں ہاتھ سے کراٹے کی ایک بھرپور ضرب اس کی گردن پر لگا دی۔

ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کی گردن ایک جانب لٹک گئی۔ وہ زمین پر گرتے ہی خاموشی سے مر گیا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز بدستور آ رہی تھی اور سعدیہ کی گنگناہٹ بھی جاری تھی۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں ڈیڑھ، دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

کیا سجاد کو پنچوانی سسٹرز میں سے کسی نے میرے قتل کا فریضہ سونپا تھا؟ میں نے سوچا...... مگر زیرو ایکس کے ایجنٹ کا ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ ذہن پر خاصا زور ڈالنے کے باوجود میں کوئی مناسب جواب تلاش نہ کر پایا۔ مجھے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ آخر پنچوانی سسٹرز کو مجھ سے ایسی کیا پرخاش تھی کہ وہ میری جان لینے پر تل گئی تھیں؟

بہرحال اس وقت سجاد کی لاش کی موجودگی مسئلہ بن سکتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سعدیہ اسے مردہ حالت میں دیکھ لے اور چیخ مار کر لمبے وقفے کے لئے بے ہوش ہو جائے۔ لاش کو ٹانگ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا، میں بستر کی طرف لے گیا اور اسے نیچے دھکیل کر چھپا دیا۔ اس کا خنجر اور آہنی پھندا میں نے اس کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

اب لاش کو اسی وقت دریافت کیا جا سکتا تھا جب کوئی بستر کے نیچے جھک کر دیکھتا۔

لاش گھسیٹنے سے قالین پر جو شکنیں پڑ گئی تھیں انہیں دور کر کے میں فون کے قریب گیا اور سیکرٹ سروس "زیرو ایکس" کے چیف کے خصوصی فون کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ نمبر ڈائریکٹری میں نہیں مل سکتا تھا۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ مجھے حیرت سی ہوئی اسے جاگتا پا کر۔ پتہ نہیں وہ کس وقت سوتا تھا؟

"شہباز بول رہا ہوں۔" میں نے سرگوشی میں اسے پوری بات بتائی۔ "میں سعدیہ کو باہر لے جاتا ہوں۔ آپ یہاں کی صفائی کروا دیں۔ ہمارا دوست سعدیہ کے بیڈ کے نیچے چھپا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے!" چیف نے بھاری آواز میں کہا۔ "تم بالکل فکر نہ کرو" اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں اطمینان سے بستر پر نیم دراز ہو گیا اور شیمپین کے گھونٹ لینے لگا۔ پانچ منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور

سعدیہ ایک نیلا جوڑا پہنے برآمد ہوئی۔ اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے چہرے کا کھلتا ہوا رنگ، مدہم نیلی روشنی اور قمیص کے کھلے ہوئے گریبان سے جھانکتی رعنائیاں، مجھے بے خود کر گئیں، میں یوں ہی ساکت بیٹھا رہ گیا۔

سعدیہ نے میری کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ ہنسی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

نہیں ــــ میں نے سوچا ــــ یہ لڑکی میرے قتل کا منصوبہ نہیں بنا سکتی۔ ایجنٹ سجاد کسی اور ہی چکر میں مجھے قتل کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ مجھے چہروں کی پہچان تھی اور سعدیہ کے چہرے پر صرف حسن ہی نہ تھا ایک عجیب سی معصومیت بھی تھی متاثر کرنے والی معصومیت۔

"آؤ چلیں ــــ" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں باہر گھما کر لاؤں۔ ویسے بھی صبح ہونے والی ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتہ بھی کرنا ہے۔" سعدیہ بلاچوں و چرا میرے ساتھ چل پڑی۔

دو گھنٹے بعد جب ہم واپس فلیٹ میں پہنچے تو تھکن، پسینہ بن کر پیشانی پر چمک رہی تھی۔ وقت گزاری کی خاطر میں سعدیہ کے ساتھ زیادہ تر پیدل ہی چلتا رہا تھا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر موقع ملتے ہی میں نے بستر کے نیچے ایک نظر ڈالی۔ ایجنٹ سجاد کی لاش غائب تھی۔ خنجر اور آہنی تار بھی وہاں موجود نہ تھا۔ میرے حلق سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔

زیرو ایکس کے ایجنٹوں نے صفائی کر دی تھی۔ اس مہارت کے ساتھ کہ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ سعدیہ کو گمان بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔

****

"اس کی موت گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے واقع ہوئی ہے۔" ڈاکٹر احمد خان نے اپنی دانست میں بہت بڑا انکشاف کیا۔ میز پر ایجنٹ سجاد کی لاش موجود تھی جس پر سفید چادر ڈھکی ہوئی تھی۔

"یہ بات تو مجھے بھی معلوم ہے۔" میں نے اس انکشاف پر چونکے بغیر کہا۔ کیونکہ اس کی گردن میں نے ہی توڑی ہے۔"

"مگر یہ تو زیرو ایکس کا پرانا اور وفادار ایجنٹ تھا۔" ڈاکٹر احمد خان کا منہ حیرت سے کھل گیا اس نے بے یقینی سے چیف کی طرف دیکھا جو فون کو اس انداز میں گھور رہا تھا جیسے اس میں سے خرگوش نکلتا دیکھ رہا ہو۔

"اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔" میں نے اسے زیادہ دیر تک حیرت میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ "اب تم ذرا اس کے دماغ کا معائنہ تو کر کے دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوگی۔"

"تمہارا مطلب ہے ...... آپریشن؟" ڈاکٹر احمد خان نے سوالیہ نگاہ سے مجھے گھورا۔ اس نے ناک پر جما چشمہ اتار لیا تھا۔

"ہاں" زیرو ایکس کے چیف نے میری جانب سے جواب دیا۔ "آپریشن کی رپورٹ کب تک ملے گی؟"

"ایک دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔" ڈاکٹر احمد خان نے سوچتے ہوئے کہا۔ چیف نے گردن ہلائی اور مجھے لے کر آپریشن تھیٹر سے باہر آگیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

"کل عراق کے صدر صدام حسین پر قاتلانہ حملہ ہوا۔" اس نے راستے میں مجھے بتایا۔ "ایک شخص، مبارک نام تھا اس کا۔ اس نے پہلے جیب سے خنجر نکالا اور اسے ہاتھ میں نچاتے ہوئے عراقی صدر کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور پھر خلاف توقع خنجر خود اپنے سینے میں گھونپ لیا جس وقت یہ واقعہ عراق میں پیش آیا اسی وقت ترکی میں بھی ایسا واقعہ رونما ہوا۔ ترکی کے وزیراعظم پر ایک رکن پارلیمنٹ نے ریوالور تان لیا مگر پھر فوراً ہی اپنی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر داغ دیا۔ وہ ہچکی لئے بغیر دم توڑ گیا تھا۔

میں کچھ بولے بغیر خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ دونوں واقعات میرے لئے حیران کن تھے۔

"ادھر مونٹی کارلو میں صدام حسین پر قاتلانہ حملے کی کوشش کرنے والے کا ایک بھائی ایک قمار خانے میں روز جوا کھیل رہا ہے اور روز جیت رہا ہے اب تک وہ دس ملین ڈالر جیت چکا ہے۔ موناکو کی حکومت نے ہم سے درخواست کی ہے کہ ان کے ملک سے اس طرح دولت کی اسمگلنگ کو بچایا جائے۔ مونٹی کارلو کی پولیس کا خیال ہے کہ قمار خانے کے مالک اور عبداللہ کے بھائی نے باہم کوئی

سازش کر رکھی ہے۔ تم فوراً مونٹی کارلو چلے جاؤ وہ شخص کل پھر جوا کھیلنا شروع کرے گا اگر وہ مزید جیتا تو یقیناً جیتی ہوئی رقم کو موناکو سے باہر لے جانے کی کوشش کرے گا تم وہاں پر زیرو ایکس کے برانچ آفس کی مدد کرنا۔ اس شخص کا نام معید الحامد ہے۔

وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکا۔" اگر..... اگر اکیلے جانے میں بور ہونے کا خدشہ ہو تو..... اپنی کسی دوست کو ساتھ لے جانا۔"

گڈ..... میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔" میں نادیہ کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس کے خاندانی جیٹ طیارے میں ہی چلے جائیں گے۔"

چیف نے متنبہ نظروں سے مجھے گھورا پھر گردن جھکالی گویا اسے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے اسے سیلوٹ کیا اور اسے تنہا چھوڑ کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا جو قریب ہی کھڑی تھی۔ چیف اپنی سرکاری گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ایک جگہ پبلک کال آفس نظر آیا تو میں نے گاڑی روک دی اور اندر جا کر نادیہ کو فون کیا دیر تک گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھا کر مخمور لہجے میں ہیلو کہا۔

" فراز بول رہا ہوں۔" میں نے کہا اس کی آواز سن کر ریسیور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

" فراز....." دوسری طرف سے ایک لمحہ کے وقفے کے بعد آواز آئی" کون فراز.....؟"

" نادیہ....." میں نے حیرانی سے کہا۔" میں فراز بول رہا ہوں ..... فراز انٹرنیشنل کمیونیکیشن کا مالک اور تمہارا دوست۔"

عجیب لڑکی ہے..... میں نے سوچا..... ایک دن اور ایک رات ساتھ رہی اور بھول بھی گئی اتنی جلدی حالانکہ ہمیں بچھڑے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ میں اپنی شناخت کرانے کے لئے جزیرے کا حوالہ دینے ہی والا تھا لیکن رک گیا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی سریلی چیخ خاصی بلند تھی۔" اوہ فراز..... مائی گاڈ! یہ تم ہو..... کہاں سے بول رہے ہو؟"

" اپنے دفتر سے....." میں نے مصلحت سے کام لینا مناسب سمجھا۔" موناکو چل رہی ہو، گھومنے کے لئے.....؟"

" تمہارے ساتھ.....؟ کیوں نہیں..... لیکن کب؟" نادیہ کی آواز میں اشتیاق واضح تھا۔" ابھی.....؟"

" ہاں ابھی....." میں نے کہا۔" لیکن یہ سفر تمہارے جیٹ کے ذریعے کیا جائے گا۔"

" ٹھیک ہے آ جاؤ..... میں انتظار کر رہی ہوں۔" نادیہ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ایک گھنٹے بعد میں اس کے پرائیوٹ ہینگر میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیٹ طیارہ شاندار تھا۔ نادیہ نے پائلٹ اور معاون پائلٹ سے میرا تعارف کرایا اور پندرہ منٹ بعد ہم ٹیک آف کر گئے۔ بحرہند اور اوقیانوس کے پانیوں پر سے گزر کر پہلے فرانس کی طرف جہاں سے مناکو زیادہ دور نہ رہ جاتا تھا۔ دوران سفر میں نے محسوس کیا نادیہ واقعی ایک اعلیٰ درجے کی میزبان بھی تھی۔

****

فرانس کا ساحل تقریباً سو میل دور تھا اور نادیہ میرے قریب بیٹھی مجھ سے والہانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی کہ جہاز نے یکایک ایک جھٹکا کھایا اور تیزی سے زمین کی طرف جانے لگا۔ نادیہ، میں اور قریب رکھی ہوئی شراب کی بوتلیں ..... سب پائلٹ کے کیبن تک لڑھکتے ہوئے چلے گئے اور بند دروازے سے جا ٹکرائے۔ نادیہ اس افتاد پر گھبرا کر چیخیں مار رہی تھی۔

طیارے کا رخ بدستور زمین کی طرف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ نیچے زمین یا کوئی جنگل نہیں جہاں طیارے کے حادثے کی صورت میں بچنے کے امکان ہوتے ہیں گہرا اور وسیع سمندر ہے جہاں صرف موت آ سکتی ہے۔ خود کو سنبھال کر میں کھڑا ہو گیا۔ پائلٹ کے کیبن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے کئی مرتبہ ہینڈل کو جھٹکا دیا مگر دروازہ لاک تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا۔ سوچنے کا وقت گزر چکا تھا۔ پہلے فائر میں ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے کنٹرول بورڈ پر پائلٹ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سن تو پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر مجھے ایجنٹ سجاد کا چہرہ یاد آ گیا۔ یہ پائلٹ بھی شاید پاگل ہو گیا تھا

جب کہ روانگی کے وقت وہ بالکل ٹھیک نظر آ رہا تھا۔

کیوں؟ اور کیسے؟ میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ طیارہ تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ میں نے فرش کی طرف دیکھا معاون پائلٹ بے ہوش پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا اسے بے ہوش کرنے میں کسی اور کا نہیں' خود پائلٹ کا ہاتھ تھا ریوالور کو ہولسٹر میں رکھ کر میں نے پائلٹ پر چھلانگ لگا دی ۔ میرا بھرپور اور زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا وہ لڑکھڑایا اور معاون پائلٹ کی کرسی پر جا گرا۔

اس نے ایک دو بار گردن جھٹکی پھر وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سرد' سفاک چمک اچانک ہی ابھر آئی تھی۔ حریف کے حملے کا انتظار کرنا حماقت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑتا۔ میں جھانسہ دے کر آگے بڑھا اور اسے کمر سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پھر یوں ہی اسے اٹھائے میں نے لات مار کر کیبن کا دروازہ کھولا اور پھینک دیا۔

اس کا سر ایک الٹی ہوئی میز سے ٹکرایا اور وہ ڈکرا کر بے ہوش ہو گیا۔ میں اسے چھوڑے بغیر دوبارہ کنٹرول بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ سمندر کا نیلا پانی اب صاف نظر آ رہا تھا میں نے پوری قوت سے بلندی کی طرف لے جانے والی اسٹک اپنی طرف کھینچ لی۔ جہاز کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپا پھر آہستہ آہستہ سیدھا ہونے لگا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اوقیانوس کا نیلا پانی دھیرے دھیرے دور ہونے لگا تھا۔

اسی وقت نادیہ پیچھے سے پھر چیخی۔" فراز ..... بچو .....!" اس کی چیخ مجھے چونکا گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

پائلٹ کو ہوش آ گیا تھا اور اب وہ لوہے کی ایک لمبی سلاخ اٹھائے کیبن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے تیور خطرناک حد تک بگڑے ہوئے تھے۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکالا اور اس پر فائر کر دیا۔ میرے آٹومیٹک کی گولی اس کے کندھے میں گھس گئی اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ سلاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

وہ لڑکھڑاتا' مختلف چیزوں سے ٹکراتا جہاز کے ایمرجنسی دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے زخم پر رکھا دانت بھینچے اور اپنی تمام تر قوت کو جمع کر کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس کے پاگل پن اور طاقت کے اس مظاہرے پر حیران رہ گیا۔ اڑتے ہوئے جہاز کے دروازے کو کھولنا بہت مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ باہر ہوا کا خوفناک دباؤ موجود ہوتا ہے۔

اس نے دروازے کو باہر کی طرف دھکیلا اور وہ کھل گیا۔ ایک لمحے کو اس نے مڑ کر میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا پھر باہر چھلانگ لگا دی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اور آنکھوں میں حیرانی تھی اس کا جسم فضا میں تیرتا ہوا نیچے جاتا رہا پھر بحر اوقیانوس نے اسے نگل لیا۔

جہاز کو بلندی کی طرف لے جاتے ہوئے میں نے سوچا ..... پہلے بھارتی گرنیڈ پر گر گیا تھا۔ پھر ایجنٹ سجاد نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی اس سے پیشتر بھارت وفد کا ایک نمائندہ بھی ایسی ہی کوشش کر چکا تھا اور اب ..... پائلٹ نے جہاز گرانا چاہا تھا۔ موت ہر سمت سے اپنا سیاہ جبڑا کھولے میری جانب بڑھ رہی تھی اور جہاں موت کی بات ہوتی تھی۔ سنجوانی سسٹرز کا اس سے تعلق ضرور نکل آتا تھا۔

مجھے سیکرٹ سروس "زیرو ایکس" کے چیف پر غصہ آ گیا جہاں بھی کوئی خطرناک کام ہوتا ہے' وہیں مجھے بھیج دیا جاتا ہے لیکن پھر میں نے گردن جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ میں "زیرو ایکس" کا ایجنٹ تھا اور جو "زیرو ایکس" کا ایجنٹ ہوتا ہے وہ اپنی زندگی آئی ایس پی آر کے ذیلی ادارے "زیرو ایکس" کو فروخت کر دیتا ہے۔

****

مونٹی کارلو کے "کیسینو رائل" میں داخل ہوتے ہوئے نادیہ میرے ساتھ تھی۔ استقبالئے پر میں نے اپنا نام جعفر لکھوایا تھا جب کہ نادیہ کو میں نے اپنی بیوی ظاہر کیا تھا۔ میرے اس جرأت مندانہ اقدام پر نادیہ نے کچھ غصے اور کچھ خوشی سے مجھے گھورا تھا۔

اسی ہوٹل میں معید الخامد جوا کھیلتا تھا جو رات کو ہوتا تھا لہٰذا وقت بہت تھا اور نادیہ اس وقت کی تلافی کرنے کے لئے موجود تھی۔ وہ کمرے میں گھستے ہی ہنسی اور مجھے اپنے ساتھ لئے بستر پر گر گئی۔ میں فاصلوں کا مطلب بھول گیا وہ سراپا شراب تھی میں قطرہ قطرہ اسے پیتا رہا۔ بہت دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور کہا "تمہیں

معلوم ہو گیا۔۔۔؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔۔۔۔ ایک بہت بڑا راز اچانک مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ میرے ساتھ لیٹی ہوئی یہ لڑکی نادیہ نہیں تھی۔ میں نے نادیہ کے ساتھ ایک رات گزاری تھی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سعدیہ بھی نہیں تھی۔ دو دن تک میں سعدیہ کے بدن سے بھی واقف ہوتا رہا تھا۔ یہ لڑکی نہ تو نادیہ تھی اور نہ ہی سعدیہ لیکن اس کی شکل ان دونوں سے مشابہ تھی وہ بہنیں تھی تو ان دونوں کا ہی گمان ہوتا تھا مگر میں جسموں کی پہچان رکھتا تھا۔

"تم صفیہ ہو۔۔۔" میں نے کہا نادیہ اور سعدیہ کی تیسری بہن۔ جسے اب تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔

اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ "جب تم نے فون پر کہا کہ مونا کو جانا ہے تو میں نادیہ کے فلیٹ میں سو رہی تھی۔ نادیہ کو معلوم بھی نہ ہوا اور میں تمہارے ساتھ چل پڑی۔ میری دونوں بہنیں میری ان ہی شرارتوں سے تنگ ہیں۔" الفاظ اس کے منہ سے ہنستے ہوئے نکل رہے تھے۔

رات کو جب کیسینو میں کھیل شروع ہوا تو مختلف میزوں کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ ایک میز کے گرد کچھ زیادہ ہی ہجوم تھا۔ میں صفیہ کو اپنے ساتھ لئے بھیڑ کو چیرتا آگے بڑھ گیا۔ لوہے کا پہیہ گھومتے گھومتے جس نمبر کر رک جاتا تھا اس نمبر پر رقم رکھنے والا شخص جیت جاتا تھا۔ ایک کونے میں پہیہ گھمانے والا شخص کھڑا تھا۔ وہ دراز قامت تھا لیکن فربہی نے اس کے قامت کو دبا دیا تھا۔ سنہری فریم کا چشمہ پہنے والے ایک جوان العمر شخص نے لال رنگ کے ٹوکنوں کا ایک ڈھیر چار نمبر پر رکھ دیا۔

"اوہ گاڈ۔۔۔" ایک عورت کہا "ابھی ذرا دیر قبل اس نے ایک لاکھ ڈالر جیتے ہیں اور ابو ساری رقم چار نمبر پر لگا دی ہے۔"

سنہری فریم کے چشمے والے شخص نے ایک لمحہ کے لئے پہیہ گھمانے والے آدمی کی طرف دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پہیہ گھمانے والے نے آہستہ سے سر ہلایا ہو۔ چشمے والا جوان العمر شخص ہی غالباً معید الخامد تھا۔ باقی لوگوں نے بھی جو کھیل میں شریک تھے، مختلف نمبروں پر اپنے اپنے ٹوکن رکھ دیئے۔ تمام ٹوکن چار رنگوں پر مشتمل تھے۔

پہیہ گھمانے والے شخص نے ایک نظر چاروں طرف دیکھا اور پہیے کو گھما دیا۔ پہیہ کچھ دیر تک تیزی سے گھومتا رہا پھر وہ آہستہ ہو گیا۔ دھیرے دھیرے بالکل سست رفتار ہوتے ہوئے پہیے کی نوک چار نمبر پر جا کر رک گئی۔ سعید کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دو لاکھ ڈالر مالیت کے ٹوکن سمیٹ لئے پہیہ گھمانے والے شخص نے اس مرتبہ اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

"ہو سکتا ہے یہ پہیہ ٹھیک نہ ہو۔ کوئی گڑ بڑ ہو اس میں۔" میں نے بظاہر صفیہ سے مخاطب ہو کر زور سے کہا۔ "آؤ دوسری میز کی طرف چلتے ہیں۔" وہاں کھڑا ہوا ہر شخص مڑ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

معید نے چشمہ اتار کر مجھے غور سے دیکھا۔ میز کے گرد ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔

"یہ جوا ہے مسٹر۔۔۔" پہیہ گھمانے والے شخص نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "ہارنے والوں جیسی باتیں مت کرو۔"

"اوہ" میں نے بظاہر چونک جانے کی اداکاری کی۔ "آئی ایم سوری۔ میں اپنی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ بے خیالی میں آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی۔ سو رفار دیٹ۔" میں صفیہ کو لے کر آگے بڑھ گیا لیکن مجھے احساس تھا کہ سب لوگ اب تک ہم دونوں ہی کو گھور رہے تھے۔

اچانک میری نظر ایک شناسا صورت پر پڑی۔ وہ انٹرپول کا ایک ایجنٹ تھا۔ دائیں طرف مجھے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ وہ مناکو میں "زیرو ایکس" کے برانچ آفس کا نمائندہ تھا۔ وہ دونوں ہی معید الخامد کی نگرانی کر رہے تھے میں مطمئن ہو کر ہال سے باہر نکل گیا معید ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مناکو سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہاں کھیل ختم ہوا تو معید الخامد ۲۰ لاکھ ڈالر مزید جیت چکا تھا۔ پہیہ گھمانے والے شخص نے پہیہ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ کھیلنے والے منتشر ہونے لگے جو لمبی رقوم ہار رہے تھے ان کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ ذرا دیر بعد کیسینو کا منیجر بھی وہاں آگیا۔ ان دونوں نے پہیہ اٹھایا اور کیسینو کے تہہ خانے کی طرف چل پڑے۔ میں باہر کھڑا اسی موقع کا منتظر تھا۔

"صفیہ" میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا "تم اپنے کمرے میں

جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی حیرت کی پرواہ کئے بغیر تہہ خانے کی طرف چل دیا۔ تہہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں پر ایک بلب روشن تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ زینے کے وسط تک پہنچا تو مجھے پہلے تہہ خانے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی پھر صفیہ کی چیخ سنائی دی۔" فراز..."

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک شخص آخری سیڑھی پر صفیہ کا ہاتھ موڑے' اسے اپنے سامنے کئے کھڑا تھا۔ میں غصہ سے اس احمق لڑکی پر دانت پیس کر رہ گیا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں جانے کی واضح تاکید کی تھی لیکن وہ میرے تعاقب میں چلی آئی تھی۔ میں نے ریوالور نکالنا چاہا لیکن اسی وقت نیچے سے کیسینیو کا منیجر اور پہیہ گھمانے والا شخص اوپر چڑھ آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

میں دونوں طرف سے گھر گیا تھا۔ ایسے میں ہیرو بننے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ منیجر قریب پہنچا اور بالکل سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔" حرام زادے" اس نے برہم لہجے میں کہا۔" جاسوسی کرنے یہاں پر گھس آیا ہے۔" ساتھ ہی اس نے پہیہ گھمانے والے شخص کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ شخص تیزی سے آگے بڑھا اور لوہے کا ایک پائپ اٹھائے میری جانب لپکا۔

میں نے بچنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میری کنپٹی پر توپ کا گولا سا پھٹ پڑا۔ کسی نے چیخ ماری پھر تاریکی مجھ پر چھا گئی۔

****

کئی الٹے سیدھے خواب دیکھنے کے بعد دھندلے سائے متحرک نظر آنے لگے۔ سر کو زور سے جھٹک کر میں نے آنکھوں کے آگے چھائی دھند کو دور کرنے کی کوشش کی۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی اور آہستہ آہستہ منظر صاف ہو تا گیا۔ وہ کوئی کار تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے ساتھ ہی صفیہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے سو رہی تھی۔ میں نے نشست پر بیٹھے بیٹھے ہلنے جلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

کوئی نشہ آور دوا... میں نے سوچا... جس نے میرے اعصاب کو شل کر دیا ہے۔ میں ہوش میں رہ کر بھی بے ہوش تھا۔ دیکھ سکتا تھا مگر اپنی مرضی سے ہل نہیں سکتا تھا۔ ایک شخص نے کار کی کھڑکی میں سے ہاتھ اندر ڈالا۔ اگنیشن میں چابی لگتے ہی کار کا انجن غرانے لگا۔ اجنبی ہاتھوں نے کار گیئر میں ڈالی اور کار چل پڑی۔ ہیڈلائٹ کی روشنی سیدھی سڑک پر پڑ رہی تھی اور درخت آہستہ آہستہ پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔

میں نے اسٹیئرنگ تک ہاتھ لے جانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو پایا۔ کار کی رفتار بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی کیونکہ میرا پیر ایکسی لیٹر پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر صفیہ پر ڈالی وہ بدستور سو رہی تھی اب تک کار خود بخود سیدھی جا رہی تھی معاً ہیڈلائٹ کی تیز روشنی میں میں نے دور سڑک کا ایک موڑ دیکھا اس موڑ کو دیکھ کر میں اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔

دانت بھینچ کر میں نے دوبارہ ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ موت کا خوف اور زندہ رہنے کی خواہش بہت شدید تھی میں قوت ارادی کے بل پر اپنی ساری طاقت بے جان ہاتھ میں لے آیا۔ انگلیاں دھیرے سے ہلیں ہاتھ اوپر اٹھنا شروع ہوا۔ ایک انچ' دو انچ' تین انچ میں زندگی کے لئے دوا کے اثرات سے لڑ رہا تھا۔ چوتھے انچ پر میرا ہاتھ مضبوطی سے اسٹیرنگ پر جم گیا۔

موڑ اب بالکل قریب آ چکا تھا میں نے اسٹیئرنگ کو تیزی سے بائیں طرف گھمایا اور تیز روشنیاں لہرا کر پیڑوں پر سے ہوتی ہوئی واپس سڑک پر پڑیں۔ اس کامیابی پر میرے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔

آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہونے لگے۔ میں نے بریک پر پاؤں رکھا مگر رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا بریک فیل کر دیئے گئے تھے ہوا کھلی کھڑکی سے چیختی چلاتی اندر داخل ہو رہی تھی اور درخت زناٹے کے ساتھ پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔ اسپیڈومیٹر کی سوئی اسی اور نوے کے درمیان تھرک رہی تھی کار کا سڑک پر رہنا ہی میری اور صفیہ کی زندگی تھا۔

میں اس لمحے کو کوسنے لگا جب میں تہہ خانے میں گھس

گیا تھا۔ محض اس لئے کہ کسی طرح پیسے کا راز معلوم کر لوں۔ اب میں اس کار میں مارا جاتا تو پوسٹ مارٹم رپورٹ کیمطابق شراب پی کر کار چلانے والوں کے لئے عبرت کا سبب بن جاتا۔ زیرو ایکس کے ہیڈ کوارٹر کو میری موت کی اطلاع کم از کم تین دن بعد ملتی۔

مونٹی کارلو اب خاصا پیچھے رہ گیا تھا۔ کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جو پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں سڑک سنسان تھی اور ٹریفک برائے نام تھا۔ لہذا موت چند لمحوں کے لئے جسم کی سرحد سے دور نظر آنے لگی۔

رات ست رفتاری سے گزرتی رہی لیکن کار کا سفر بھی جاری تھا اور موناکو کی سرحد بہت دور رہ گئی تھی۔ نائس کا قصبہ آ گیا اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں کانپتا رہا۔ سڑک کے بیچ میں بنی ہوئی سفید پٹی، کار کے نیچے سے کسی زخمی سانپ کی مانند سرسراتی، پیچھے کی طرف بھاگتی رہی۔ اسٹیر آیا اور گزر گیا۔ شہر کی سڑکوں پر کار کے ٹائر بار بار پر شور آوازیں کراہ رہے تھے اور پر کینز آ گیا۔ کار کے انجن نے ایک جھٹکا لیا۔ شاید پیٹرول ختم ہو رہا تھا۔ ایک میل مزید چلنے کے بعد کار کی رفتار خود بخود کم ہونے لگی اور دو میل کے بعد کار یوں رک گئی جیسے صحرا میں راستہ بھٹک جانے والا بھوک پیاس میں دم توڑ دے۔

میرا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ یوں جیسے کسی نے مجھ پر پانی کا گیلن الٹ دیا ہو۔ کار کے رکتے ہی میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آسمان پر صبح کاذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا گزری ہوئی رات ایک بھیانک خواب کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ صفیہ اب بھی بے ہوش تھی میں نے کار کو دھکا دے کر سڑک کے ایک جانب کھڑا کیا۔ پچھلی سیٹ پر جا کر کوٹ اتارا، سرہانے رکھا اور سو گیا میں زندگی کی بازی جیت جانے کے بعد اپنے وجود میں عارضی تھکن محسوس کر رہا تھا۔

****

ایک ٹرک ڈرائیور نے دوسرے دن، سڑک کے کنارے کھڑی صفیہ کی ایک معنی خیز مسکراہٹ کے عوض ہمیں واپس مناکو پہنچا دیا تھا۔ جب میں مونٹی کارلو پہنچا تو وہاں کے "زیرو ایکس" کے برانچ چیف نے مجھے ایک اندوہ ناک خبر سنائی "آج صبح ہی ایک عجیب بات ہوئی۔ ہم نے کیسینو رائل کے گرد اپنے کئی آدمی متعین کر دیئے تھے مگر۔۔۔ مگر صبح سے کیسینو کا منیجر، معید الخالد اور وہ پیسہ گھمانے والا شخص تینوں ہی غائب ہیں۔" مقامی چیف نے کہا اور متاسف انداز میں اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"غائب ہو گئے وہ تینوں۔۔۔" میرا چہرہ حیرت کی کیچڑ سے لتھڑ گیا۔ "مگر کیسے۔۔۔؟"

"رات کو ایک ہیلی کاپٹر مونٹی کارلو پر چکر کاٹتا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہیلی کاپٹر نے رسے کی مدد سے معید، منیجر اور پیسہ گھمانے والے شخص کو ان کے کمرے کی کھڑکی سے اٹھا لیا۔ معید الخالد جاتے جاتے پندرہ ملین ڈالر بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہیلی کاپٹر موناکو کے آس پاس ہی کہیں ہے۔ اٹلی کی سرحد میں تو وہ نہیں جا سکتے۔ شاید وہ سمندر میں موجود جزیروں میں سے کسی ایک جزیرے میں چھپے ہوئے ہیں۔" مقامی چیف نے تفصیل بتائی اور خاموش ہو گیا۔

میں نے ایک ہیلی کاپٹر اور ایک ماہر پائلٹ کی فرمائش کی جسے مقامی چیف نے دس منٹ بعد پورا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اسی وقت پاکستان سے زیرو ایکس کے چیف کا فون آ گیا۔ ریسیور مقامی چیف نے اٹھایا تھا لیکن فوراً ہی مجھے تھما دیا تھا۔

"بہت اچھے شہباز۔۔۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے اور بھاری آواز میں کہا۔ "تمہارا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ تم نے ایجنٹ سجاد کے دماغ کا آپریشن کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیبارٹری میں ڈاکٹر احمد خان نے اس کا آپریشن کیا تو اس کے دماغ میں ایک کمپیوٹرائزڈ ڈسک لگی ہوئی دیکھی۔ لوہے کی ایک باریک سی پتری، آدھا سینٹی میٹر لمبی۔ اگرچہ لیبارٹری میں اس پر مسلسل تحقیق جاری ہے مگر ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے گزری ہوئی بھیانک رات کی تفصیل بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا "شہباز! میرے بیٹے! ہوشیار رہنا مجھے اور زیرو ایکس کو تمہاری زندگی کی بہت ضرورت ہے۔ پاک وطن تم جیسے ہر جیالے

سپوت پر فخر کرتا ہے۔"

میں نے ہنس کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ زیرو ایکس کا مقامی چیف مجھے لے کر باہر نکل گیا۔

شہر سے گیارہ' بارہ میل دور سنسان اور بنجر ریت کے ٹیلوں کے درمیان نیلے رنگ کا ایک ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔ پائلٹ اس کے نزدیک ہی موجود تھا۔ وہ ایک نوجوان سا لڑکا تھا اور اس کا نام مارسیل تھا۔ مقامی چیف نے مجھے اس سے متعارف کروایا پھر مارسیل کو ضروری ہدایات دیں اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوا اور بحیرہ روم کی طرف بڑھتا چلا گیا ہم ساحل کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے۔

ہمارے ایک طرف پانی تھا اور دوسری جانب زمین اور یہیں پر کہیں وہ لوگ موجود تھے جو پندرہ ملین ڈالر چرا کر لے جا رہے تھے۔ اگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو موناکو جیسے چھوٹے ملک کی معاشی اور اقتصادی صورتحال کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ میں دوربین سے نیچے دیکھتا رہا۔ ساحل کے ساتھ اب جزیرے شروع ہو گئے تھے۔ غیر آباد' سنسان اور چھوٹے بڑے جزیرے جو مجرموں کے لئے بہترین پناہ گاہ تھے۔

اچانک ایک جزیرے کی چٹانوں کے درمیان مجھے ایک ہلکی سی چمک محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ ہیلی کاپٹر تھا۔ مفرور ہونے والوں کا ہیلی کاپٹر جس کی چمکدار دھات سے سورج کی روشنی ٹکرا کر چمک پیدا کر رہی تھی۔

"مارسیل" میں نے انجن کے شور میں چیخ کر کہا۔ "ہیلی کاپٹر واپس موڑو۔ اس جزیرے پر سے نیچی پرواز کرنی ہے۔"

نوجوان مارسیل نے اثبات میں سر ہلایا اور ہیلی کاپٹر موڑ لیا۔ جزیرے پر سے جب ہم دوبارہ گزرے تو ہیلی کاپٹر خطرناک حد تک نیچی پرواز کر رہا تھا۔ چٹانوں کے درمیان مجھے وہ ہیلی کاپٹر نظر آ گیا۔ میں نے دوربین فوکس کی۔ ہیلی کاپٹر کے پاس سیاہ رنگ کے کچھ جانور رینگ رہے تھے میں انہیں دیکھنے میں منہمک تھا کہ مارسیل چیخا مسٹر شہباز..... اپنا سر نیچے جھکا لو۔"

****

گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور کھڑکی سے لے کر کاک پٹ کے شیشے تک میں سوراخ کرتی چلی گئی۔ نیچے چار آدمی' سب مشین اٹھائے فائر کر رہے تھے۔ گولیوں کی دوسری بوچھاڑ آئی مگر تب تک ہم افقی انداز میں مڑ چکے تھے۔ ہیلی کاپٹر نے ایک جھٹکا لیا اور نیچے گرنے لگا۔

"مارسیل" میں نے چیخ کر کہا۔" ہیلی کاپٹر کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

وہ میری طرف مڑا اور میں اس کا وحشت زدہ چہرہ دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کے سارے منہ پر خون ہی خون تھا اور گردن کے پاس ایک سوراخ تھا جس کے کنارے بارود سے سیاہ پڑ گئے تھے۔ سرخ لہو اس میں سے بہتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے صرف خون ہی نکل سکا اس کی زبان کوئی لفظ ادا نہ کر سکی پھر وہ اپنی نشست سے نیچے گر گیا۔

ہیلی کاپٹر کے انجن میں آگ لگ گئی تھی اور وہ تیزی سے سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر کی جانب چھلانگ لگا دی۔ ہیلی کاپٹر اور میں دونوں ایک ساتھ ہی سمندر میں گرے۔ جب میں سطح آب پر ابھرا تو میرے اور جزیرے کے بیچ میں' پانی کی سطح پر جلتا ہوا ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے فاصلے کا اندازہ لگایا اور غوطہ لگا کر پانی کے اندر ہی تیرنے لگا۔

جب پھیپھڑے جواب دینے لگے تو میں نے ہانپتے ہوئے سانس لینے کے لئے منہ پانی سے باہر نکالا جزیرے کا ساحل تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور ہیلی کاپٹر کا فولادی ڈھانچہ بحیرہ روم کے پانی میں مارسیل کی خون میں لتھڑی لاش سمیت غرق ہو چکا تھا۔ میں ساحل پر واقع ایک چٹان کا سہارا لے کر اوپر چڑھا اور ریت پر رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا ایک طویل میدان کے بعد چند پیڑ کھڑے دکھائی دیئے۔ میں آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے دائیں طرف کھسکتا گیا۔

اچانک ایک سرد نال میری پشت سے آ لگی۔ میں اچھل پڑا اور تیزی سے پلٹا لیکن دانت پیسنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ وہ نہ جانے کب میرے قریب آ گئے تھے۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو مسٹر....." ایک آواز آئی اور میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ایک ہی شخص نے آگے بڑھ کر

میرے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

میرے سامنے... چاروں کھڑے تھے۔ معید الخامد کیسینو کا منیجر' پہیہ گھمانے والا اور ایک اجنبی' نیا چہرہ غالباً پائلٹ کا تھا جو ہیلی کاپٹر پر انہیں یہاں تک لایا تھا۔ وہ مجھے ایک کشادہ غار میں لے گئے۔ جہاں باہر چمکنے والے سورج کی ایک کرن بھی نہ پہنچ پا رہی تھی۔ غار کے وسط میں لکڑی کی شاخیں جل رہی تھیں۔ جن کے نارنجی شعلوں کی روشنی میں' غار میں موجود پانچوں افراد کے سائے دیوار پر متحرک تھے۔

معید نے میری تلاشی لی لیکن کافی چالاک نظر آنے کے باوجود وہ میرے بازو کے نیچے بغل کے پاس' ایک اسپرنگ سے منسلک چاقو کو تلاش نہ کر سکا۔ پہیہ گھمانے والے شخص نے میرے کولہے پر ایک زوردار لات ماری اور مجھے فرش پر الٹ لیٹ جانے کا حکم دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں ایک موٹی رسی سے باندھ دیئے گئے۔ پھر انہوں نے اطمینان سے بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے میری موجودگی کو فراموش کر دیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد کہیں دور سے ایک مدہم سی آواز آئی۔ یہ آواز کسی جہاز کے سائرن سے مشابہ تھی۔ چاروں نے تاش پھینک دیئے اور اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ معید الخامد ایک تاریک گوشے سے ایک بڑا چرمی سوٹ کیس اٹھا لایا۔

"جہاز آ گیا ہے پہلے ہم ہیلی کاپٹر کو جہاز پر چھوڑ آئیں پھر تمہیں بھی لے جائیں گے۔ منیجر نے پہیہ گھمانے والے شخص سے کہا۔ تب تک تم اس اسٹور کے بچے کا خیال رکھنا جو خواہ مخواہ ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"مگر تم ..... تم واپس بھی آؤ گے یا نہیں؟" پہیہ گھمانے والے شخص نے بے یقینی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشکیک تھی۔

"ضمانت مانگ رہے ہو؟" معید نے ہنس کر کہا۔ "یہ لو اس نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا۔ پندرہ ملین ڈالر یہیں پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر جہاز پر اتار کر ہم کشتی میں واپس آئیں گے۔"

پہیہ گھمانے والے شخص نے مطمئن انداز میں سرہلایا اور تینوں افراد باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد باہر سے ہیلی کاپٹر کے انجن سے عجیب سی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ غالباً ایندھن کم تھا اب ایک ہی شخص میری حفاظت کے لئے رہ گیا تھا میں دم سادھے پڑا تھا۔

اس نے مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ قریب آ کر اس نے میری بندشوں کی سختی کو ہاتھ سے محسوس کر کے دیکھا' پھر کچھ دور فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس میں بھری شراب کو گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ مجھے بوتل خالی ہو جانے کا انتظار تھا۔

پانچ منٹ بعد میرے ہاتھ کے ایک مخصوص جھٹکے سے میرا چاقو میرے دائیں ہاتھ میں آ چکا تھا۔ آہستہ آہستہ رسیاں کٹتی گئیں اور بوتل میں موجود شراب ختم ہوتی گئی اس نے خالی بوتل دیوار پر ماری تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا اس نے حیرت اور بے یقینی سے مجھے اپنے پاس کھڑے دیکھا۔ اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی پھر اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی مگر چاقو کی تیز دھار اس کے جسم میں اترتی چلی گئی۔ اس نے چیخنا چاہا ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر میں نے دوسرا وار کیا۔ میرا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر تڑپتے رہنے کے بعد وہ ختم ہو گیا۔

****

میں نے اسی کے لباس سے اپنا خون آلود ہاتھ اور چاقو صاف کیا۔ پھر سوٹ کیس کھول لیا اس میں پندرہ ملین ڈالر موجود تھے۔ غار کی تلاشی لینے پر مجھے وہاں ایک بڑا تھیلا پڑا مل گیا جو سوتی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ شاید اس تھیلے میں وہ کھانے پینے کی چیزیں بھر کر لائے تھے میں نے ڈالروں کی گڈیاں اس تھیلے میں بھرنی شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ سوٹ کیس خالی ہوتا گیا اور تھیلا پھول کر موٹا ہوتا چلا گیا۔

تھیلے میں ساری رقم پہنچ گئی تھی میں نے سوٹ کیس میں پتھر بھرے اور نوٹوں کی چند گڈیاں ان کے اوپر سجا دیں۔ یہ گڈیاں اس انداز میں رکھی گئی تھیں کہ اوپر سے دیکھنے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سوٹ کیس بدستور رقم سے بھرا ہوا ہے اور اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔ سوٹ کیس واپس اپنی جگہ رکھ کر میں نے پہیہ گھمانے والے شخص کی لاش اٹھائی اور غار سے باہر نکل گیا۔

دائیں طرف ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ جسے تینوں آدمی اسٹارٹ

کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میں چٹانوں کی آڑ لیتا بائیں طرف بڑھتا چلا گیا جہاں گھنی خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ ایک بڑی سی جھاڑی کے پیچھے میں نے لاش پھینک دی۔ اسی وقت معید اچانک غار کی سمت بڑھا اور اس کے اندر چلا گیا۔ میں اپنی جگہ چھپا اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

"جیرالڈ غائب ہے۔" اس نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔"وہ فراز کا بچہ اسے کہیں اغوا کر لے گیا!"

"احمق آدمی! رقم دیکھو...... رقم محفوظ ہے یا نہیں۔" منیجر کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔"جیرالڈ جائے جہنم میں!"

معید الخامد واپس غار کے اندر بھاگتا ہوا گیا۔ سوٹ کیس باہر لا کر اس نے ایک چٹان پر رکھا اور اسے کھول کر دیکھا اوپر کی چند گڈیاں دیکھتے ہی اس نے سوٹ کیس جلدی سے بند کر دیا۔ گھبراہٹ اور عجلت میں اسے یہ خیال نہ آیا تھا کہ گڈیوں کو ہٹا کر دیکھتا۔ میری تدبیر کارگر رہی۔ وہ وقتی طور پر جھانسے میں آ گیا تھا۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ پتھروں کا وزن ڈالروں کے وزن سے بڑھنے نہ پائے۔

شکر ہے! رقم پوری موجود ہے۔ اس نے آسودہ لہجے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا۔" شاید فراز کو رقم کا دھیان نہیں رہا ہو گا۔"

تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر اسٹارٹ ہو گیا اور وہ تینوں اس میں بیٹھ کر فضا میں پرواز کر گئے۔ میں اب بھی ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور سمندر کی سرکش لہروں کے درمیان ایک جہاز لنگر انداز دکھائی دے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا رخ اسی جہاز کی طرف تھا۔

وہ رات میں نے غار میں ہی لکڑیاں جلا کر گزاری۔ غار میں اَن گنت سیاہ چوہے تھے جن کی جسامت ایک عام بلی کے برابر تھی۔ یہ چوہے موت کا خوف بن کر ہر طرف سے مجھے ڈرا رہے تھے۔ جتنا الاؤ ٹھنڈا پڑنے لگتا تو وہ اچھلتے کودتے میرے قریب آنے کی کوشش کرتے۔ غار میں لکڑیوں کی کمی نہ تھی۔ رات بھر میں الاؤ میں لکڑیاں ڈالتا رہا اور قریب آنے والے چوہوں کو جلتی لکڑی مار کر بھگانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ ایسے میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساری رات وہ خوفناک چوہے میرے اردگرد، غار کے تاریک گوشوں میں بیٹھے، پلکیں جھپکائے بغیر مجھے گھورتے رہے۔ وہ ہر لمحہ اس انتظار میں تھے کہ مجھے غافل پا کر مجھ پر جھپٹ پڑیں لیکن میں اپنی جگہ مستعد تھا صبح ہوئی تو میں نے ایک جلتی ہوئی لکڑی ان کے ایک بڑے ہجوم پر دے ماری اور باہر نکل آیا۔ رات کو جس جھاڑی کے پیچھے میں نے پیسہ گھمانے والے کی لاش پھینکی تھی وہاں اب ہڈیوں کا ایک پنجر پڑا تھا۔ میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ ہڈیوں کا گوشت یقیناً جزیرے پر موجود ہزاروں سیاہ چوہوں کی غذا بن چکا تھا۔

****

ایک گھنٹے بعد مجھے پولیس کی ایک لانچ دور سے گزرتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے پیسہ گھمانے والے شخص سے چھینا ہوا ریوالور نکالا اور لگاتار کئی ہوائی فائر کر ڈالے۔ لانچ مڑی اور تیزی سے جزیرے کی طرف آنے لگی۔ انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی میری کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد میں "زیرو ایکس" کے مقامی چیف کے سامنے بیٹھا تھا وہ میری کارگزاری سے بے حد خوش تھا۔

"شکریہ شہباز" اس نے اپنے فرضی بالوں پر تصور میں ہاتھ پھیرا۔ "وہ پندرہ ملین ڈالر انتظامیہ کو واپس کر دیئے گئے ہیں۔" مگر اصل مجرم تو بچ کر نکل گئے ہیں!" میں نے کہا۔

"تم ان کی فکر نہ کرو۔ موناکو اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے سے بچ گیا ہے۔" مقامی چیف نے کہا "تم آج موناکو کے صدر کے ساتھ کھانا کھاؤ گے!" میں پورے چار دن تک اسٹیٹ گیسٹ بنا رہا۔ صفیہ مسلسل میرے ساتھ تھی۔ میرے اعزاز میں موناکو کی حکومت نے طلسم ہفت در کھول دیا تھا۔ پانچویں دن پاکستان سے فون آیا اور "زیرو ایکس" کے چیف نے مجھے اس طلسم سے نکالا۔" شہباز! ان کی آواز میں تشویش تھی۔ "پھر گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تم فوراً پاکستان پہنچو اور مجھ سے ملو۔ نادیہ کو بھی ساتھ لیتے آؤ۔ مجھے اب تک پنچوانی سسٹرز پر شبہ......"

"نادیہ...... میں نے چیف کی بات کاٹ دی۔ کون نادیہ پنچوانی......؟ انداز سوالیہ ہی تھا۔

میں نادیہ پنچوانی کی بات کر رہا ہوں جو گزشتہ ایک ہفتے سے

تمہارے ساتھ ہے۔" چیف کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

"وہ صفیہ ہے۔" میں نے کہا۔" نادیہ کی بہن۔ ویسے شکل و صورت میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ مجھے بھی اب تک یقین نہیں ہے۔"

چیف نے ایک طویل ہنکارا بھرا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ریسیور رکھ کر اپنی خواب گاہ میں پہنچا اور صفیہ کو یہ اطلاع دی۔

بستر پر دراز صفیہ نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ سنایا اور موناکو میں ہمارے قیام کی آخری رات کو تاریک اور تنہا ساحل پر منانے کی پیشکش کی۔ تجویز بلاشبہ اچھی تھی میں نے فوراً ہی قبول کر لی۔

کراچی کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں صفیہ کو چھوڑ کر میں سیدھا چیف کے پاس پہنچا۔ وہ شاہین کمپلیکس کے ساتویں فلور پر اپنے کمرے میں میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ٹانگیں زمین پر رکھیں اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ چینی سفارت خانے کو کل شام ہی موصول ہوا تھا۔" اس نے لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

میں نے لفافہ کھول لیا۔ اس کے اندر ایک سفید کاغذ تھا جس پر چند سطریں ٹائپ تھیں میں نے غور سے ان سطروں کو پڑھا۔

"بارہ گھنٹے قبل جو ایٹمی میزائل، چین کے ایک جہاز سمیت چرا لیا گیا تھا واپس کیا جا سکتا ہے۔ پندرہ ملین ڈالر کے عوض۔ اگر شرط منظور ہو تو کل کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار میں اشتہار چھپوا دیا جائے جس میں یہ لکھا ہو ـــــ سکندر بیٹا! ہمیں تمہاری تمام شرائط منظور ہیں فوراً گھر آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا ـــــ تمہارا بھائی۔"

"پس نوشت! مزید ہدایات اس اشتہار کو دیکھنے کے بعد دی جائیں گی۔"

"ہماری سیکرٹ سروس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر حرکت، ہر واقعے کو مشتبہ سمجھتی ہے۔" میں نے خط چیف کو لوٹاتے ہوئے کہا۔" یہ احمقانہ خط یقیناً کسی شریر بچے نے ٹیلی ویژن کی کسی جاسوسی فلم سے متاثر ہو کر لکھ دیا گیا ہو گا۔ اسے گمان تک نہ ہو گا کہ زیرو ایکس کے چیف کی راتوں کی نیند محض اس خط کی وجہ سے حرام ہو گئی ہو گی۔"

چیف نے اطمینان سے میری بات سنی اور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ میرے لئے اس کا یہ سکون اور تحمل خلاف توقع تھا۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا مگر چین کا ایک ہوائی جہاز واقعی ایک ایٹمی میزائل سمیت غائب ہو گیا ہے۔ آزمائشی پرواز کے دوران پائلٹ گزشتہ مہینے حکومت چین کے ایک وفد کے ساتھ پاکستان کے دورے پر آیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں خاصی مشتبہ رہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ دشمنوں نے اس کے دماغ میں بھی گڑبڑ کر دی ہو گی۔" چیف نے ہلکے سے توقف کے بعد کہا۔

"تم نے غور نہیں کیا! انہوں نے میزائل کے عوض پندرہ ملین ڈالر مانگے ہیں۔ اتنی ہی رقم جتنی تم نے ان سے چھینی تھی۔ چین نے ایک خفیہ معاہدے کے تحت پاکستان کو تین سو میگاواٹ کا بجلی گھر اور ایف سترہ طیاروں کے ساتھ یہ میزائل بھی ہمیں دینے کا وعدہ کیا تھا اگرچہ امریکہ اور بھارت، چین پر سخت سفارتی دباؤ ڈال رہے ہیں لیکن ہمارا دوست اب بھی اپنے مؤقف پر قائم ہے۔"

بات اب کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ باقی بات زیرو ایکس کے ذیلی آفس کے ٹاپ فلور کے کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے چار چینیوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ترجمان کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ وہ حکومت چین کے اعلیٰ اختیارات کے حامل نمائندے ہیں اور حکومت چین اس میزائل کو جہاز سمیت حاصل کرنے کے لئے پندرہ ملین ڈالر دینے کو تیار ہے۔

اسی وقت ملک کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار میں مطلوبہ اشتہار کی بکنگ کروا دی گئی۔ چاروں چینیوں نے رخصت ہونے سے قبل ہمیں جھک کر اپنے روایتی انداز میں تعظیم دی اور باہر نکل گئے۔ ان کی رہائش اور طعام کا بندوبست حکومت پاکستان کے خرچ پر ایک اعلیٰ ہوٹل میں کیا گیا تھا۔

"دشمن بہت چالاک اور بے حد خطرناک ہے شہباز۔" چیف نے اپنی جیب سے نئی سگریٹ نکالی۔ "وہ یقیناً کوئی

جنونی ہے۔ پاگل ہے۔ معصوم لوگوں کے دماغوں پر اتنا خطرناک آپریشن کرکے، دماغ میں کمپیوٹرائزڈ آلہ لگانا آسان نہیں۔ اس میں انتہائی فنی مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ یقیناً کسی معمولی شخص کا کام نہیں ہے۔" اس کی پیشانی بہت زیادہ سوچنے کی وجہ سے موٹی شکنوں سے بھر گئی تھی۔

****

ہوٹل کی راہداری میں نیم تاریکی تھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے لائٹ آن کی۔ وہ میرے بستر پر نیم دراز تھی۔ یکایک باہر بارش شروع ہو گئی اور قطرے کھڑکی کے شفاف شیشوں پر ہولے ہولے دستک دیتے رہے۔ صفیہ دیر تک میرے بازوؤں کے حصار میں کانپتی رہی اور میں اسے تسخیر کرتا رہا۔

دوسرے دن کے اخبار میں گمشدہ سکندر کے لئے اس کے بھائی کا اشتہار موجود تھا۔ جس میں تمام شرائط مان لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے چیف نے دوپہر کے تین بجے تک سگریٹ کا ایک پورا پیکٹ پی ڈالا۔ میزائل کی پراسرار انداز میں گمشدگی نے اس کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ تین بج کر بیس منٹ پر ایک ایجنٹ نے ایک کیسٹ ہمیں لا کر دیا جو ایک بچے کے ذریعے اسے ملا تھا۔

چیف نے فوراً ٹیپ ریکارڈر کا انتظام کیا۔ کیسٹ سے آہستہ آہستہ موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد یہ بے ہنگم موسیقی اچانک بند ہو گئی اور کمرے میں ایک تیز' کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔ "میں سکندر بول رہا ہوں۔ تمہارا پیغام مل گیا ہے۔ ہدایات بھجوا رہا ہوں۔ کل دوپہر کو کراچی کے مغربی ساحل سے تیس میل دور، مشرق کی طرف ایک جہاز لنگر انداز ہو گا۔ اس پر سفید جھنڈا لہرا رہا ہو گا جس پر ایک انسانی کھوپڑی بنی ہوئی ہو گی۔ اپنی کسی بوٹ یا جہاز میں پندرہ ملین ڈالر سمیت اس جہاز کے پاس پہنچو۔ پندرہ ملین ڈالر دو۔ میزائل وصول کرو اور واپس چل پڑو۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میزائل اڑا دیا جائے گا۔ شہباز کو مبارک ہو۔ زندگی کے اعتبار سے وہ بہت خوش قسمت ہے۔"

ٹیپ اب بھی چل رہا تھا لیکن آواز آنی بند ہو گئی تھی اور صرف اسپیکروں کی گھر گھر باقی رہ گئی تھی۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ بولنے والے نے اس جہاز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جسے میزائل سمیت چرا لیا گیا تھا۔ گویا وہ کمیشن کے طور پر اس جہاز کو ہضم کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چوبیس گھنٹے انتظار کے کرب میں گزارنے کے بعد آخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا انتظار تھا۔

مسئلہ حل ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ کراچی کے ساحل سے تیس میل دور کھڑے اس جہاز کے کیپٹن نے ہم سے پندرہ ملین ڈالر لئے جہاز پر نصب شدہ ایک دیوہیکل کرین کے ذریعے ایٹمی میزائل ہمارے جہاز پر پہنچایا اور تیز رفتاری سے اپنی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو گیا۔

چیف اس تمام کارروائی کے دوران عرشے پر بے چینی سے ٹہلتا رہا تھا۔ میزائل جب حفاظت سے ہمارے جہاز پر پہنچ گیا تو چیف نے ٹہلتے ہوئے اپنا سر کھجایا پھر ریلنگ کا سہارا لے کر جھکا اور سمندر کے پانی کو دیکھنے لگا۔ میں اس کی ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جہاز زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس نے وائرلیس نکال لیا۔ "آل زیرو ایکس شپس آن ڈیوٹی" اس نے ماؤتھ پیس میں چیخ کر کہا۔ "سفید رنگ کے جھنڈے والے جہاز کو ہر طرف سے گھیر لو۔"

ہمارا جہاز بھی اس جہاز کے تعاقب میں چل پڑا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ جہاز ہمارے گھیرے میں آ گیا۔ چیف نے کئی جہازوں کا انتظام کر رکھا تھا جو اب چاروں طرف سے اس جہاز کا راستہ مسدود کرتے جا رہے تھے۔ سفید جھنڈے والا جہاز بائیں طرف مڑا مگر وہاں پر دو جہاز پہلے سے موجود تھے یہ جنگی جہاز تھے اور ان کی توپوں کا رخ اسی جہاز کی جانب تھا۔

اس نے تیزی سے آگے نکلنے کی کوشش کی مگر دو جہاز بیک وقت اس کی راہ میں آ گئے۔ فرار کی کوئی راہ اس جہاز کے لئے نہیں رہی تھی۔ وہ گھیرے کو توڑ کر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ وہ ایک عام سا جہاز تھا اور عام سا جہاز' جنگی جہازوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

میں چیف کی اس عیاری پر مسکرا دیا۔ گویا اس نے ان لوگوں کو زندہ گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ ان سے اصل مجرم کے بارے میں کچھ اگلوایا جا سکے اور وہ رقم جو

بطور تاوان دی گئی تھی اسے بھی دوبارہ حاصل کرلیا جائے۔ اس سے پیشتر کہ چیف، مائیک کے ذریعے اس جہاز کے عملے کو کوئی حکم دیتا۔ یکایک آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی ہم پر پڑی۔ یہ تیز روشنی دو یا تین سیکنڈ تک ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتی رہی پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اس دھماکے کے ساتھ ہی اس جہاز کے پرخچے اڑ گئے جس پر سفید رنگ کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔

چیف اور میں اپنے جہاز کے عرشے پر منجمد کھڑے رہ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ آخر یہ ہوا کیا تھا؟ وہ تیز روشنی کیسی تھی؟ اور جہاز اس بُری طرح تباہ کیسے ہو گیا تھا؟ چند لمحوں بعد جہاز کی جگہ صرف لکڑی کے تختے سمندر کی اونچی سطح پر تیرتے رہ گئے۔

"یہ کیا ہو گیا؟" چیف نے میری طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ حیرت اور اچنبھے سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے شانے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں خود بھی معاملے کی اصل نوعیت تک نہ پہنچ پایا تھا۔

****

تین دن بعد چیف نے ایک مرتبہ پھر مجھ سے وہی سوال پوچھا اور میں نے اس مرتبہ بھی لاعلمی کے اظہار کے طور پر شانے اچکا دیئے۔ ان تین دنوں میں نیوی کے لاتعداد غوطہ خوروں نے پانچ میل کے دائرے میں پورے سمندر کو کھنگال ڈالا مگر پانچ میل کے علاقے میں سے کوئی لاش نہ مل پائی اور نہ ہی وہ سوٹ کیس جس میں پندرہ ملین ڈالر تھے۔ غوطہ خوروں کو جہاز کے ٹکڑے اور انجن کے اسپیئر پارٹس مل گئے لیکن جہاز کا عملہ اور رقم نہ ملی۔

ایک ہفتے بعد حکومت یوگوسلاویہ کی بھیجی ہوئی ایک رپورٹ پڑھ کر چیف نے اپنا سر پکڑ لیا۔ رپورٹ کے مطابق یوگوسلاویہ کے ساحل کے پاس بحری پولیس کو ایک آبدوز ملی تھی جس پر واضح حروف میں "سکندر ثانی" لکھا ہوا تھا۔

چیف نے رپورٹ کو پھاڑ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور میری طرف ان ٹکڑوں کو اچھال دیا۔

"مجرم جہاز سے آبدوز میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ وہ رقم بھی اپنے ساتھ لے گئے اور میں "زیرو ایکس" کا چیف ہو کر کچھ بھی نہ کرسکا۔"

دیر تک وہ سر پکڑے خاموش اور اداس بیٹھا رہا۔ میں بھی اس انکشاف پر دنگ رہ گیا تھا۔ جتنی دیر چیف خاموش رہا۔ میں اس اثناء میں تیز روشنی اور جہاز کی تباہی کا مسئلہ حل کر چکا تھا۔ جہاز میں یقیناً کئی طاقتور بم نصب تھے۔ جنہیں آبدوز سے آپریٹ کیا جارہا تھا۔ سفید جھنڈے والے جہاز کا عملہ آبدوز سے چھوڑی جانے والی تیز روشنی کی آڑ میں آبدوز میں رقم سمیت پہنچ گیا تھا۔ عملے کے آبدوز میں پہنچتے ہی ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اس جہاز میں رکھے ہوئے بموں کو تباہ کردیا گیا ۔ شدید دھماکہ بموں کے پھٹنے کا ہی تھا۔ بموں کے پھٹتے ہی جہاز کا تباہ ہو جانا لازمی تھا۔

میزائل اور جہاز کو اغوا کرنے والے اتنے احمق اور سادہ نہ تھے جتنے کہ چیف نے سمجھ لئے تھے انہیں یقین تھا کہ جہاز کو اتنی آسانی سے نکلنے نہیں دیا جائے گا لہٰذا انہوں نے متبادل انتظام کرلیا تھا اور بالآخر یہ متبادل انتظام کارگر ہی رہا تھا۔

ٹیلی فون کی مہربان گھنٹی نے کمرے میں چھائی خاموشی کو منقطع کردیا۔ خاموشی کے ٹوٹتے ہی میرے نتھنوں سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔ وہ ریسیور اٹھائے غالباً کسی ایجنٹ کی رپورٹ سنتا رہا۔ اس کا چہرہ اب تک بالکل سپاٹ تھا مگر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا پھر مسکراہٹ اس کے چہرے پر چمک اٹھی۔ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر وہ میری طرف مڑ گیا۔

"ریسرچ ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ آئی ہے۔ وہ چہکتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ بھارتی سفیر، ایجنٹ سجاد اور دنیا بھر میں قتل کرنے کی کوشش کرنے کے بعد خودکشی کر لینے والے تمام افراد میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ سب موٹے تھے۔ وزن ان کے لئے انتہائی اہم مسئلہ تھا۔ اب ہمیں ایک اور اہم بات کا پتہ چلا ہے۔ مرنے والے تمام افراد سوئٹزرلینڈ میں ایک وزن کم کرانے کے ادارے کے مریض تھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میرے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔ ظاہر ہے وزن بڑھنا بھی ایک بیماری ہے اور بیماری میں مبتلا شخص کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور جاتا ہے۔ اگر ان موٹے لوگوں نے بھی جو اپنی فربہی سے عاجز

تھے' کسی وزن کم کرنے والے ادارے میں اپنا علاج کرایا تھا تو اس میں تشکیک کی بات کیا ہے؟"

چیف مجھے خاموشی سے سنتا رہا۔ میں چپ ہوا تو اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ رینگ آئی جیسے میں نے اب تک نری بکواس کی ہو۔

"تم جا کر اس ادارے کو چیک کرو۔" چیف نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ڈاکٹر گھنشام اس ادارے کو چلاتا ہے۔ برن کے مضافات میں' پہاڑیوں کے دامن میں یہ ادارہ واقع ہے۔ ادارے کا نام "سلم ہیلتھ کلینک" ہے۔

****

ہوٹل میں صفیہ نے سوئٹزرلینڈ جانے کا فیصلہ بڑی خوشی سے سنا۔ وہ بھی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی تھی جب کہ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

"لیکن مائی ڈیئر!" میں نے کہا۔ "میں وہاں بزنس کے چکر میں جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں کتنے دن لگ جائیں اور جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ تم وہاں جا کر محض بور ہو گی۔ میرے ساتھ چلنے سے تو بہتر ہے کہ تم یہیں کراچی میں قیام کرو۔"

"نہیں!" وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح مچل پڑی۔ اس بچے کی مانند جسے کھلونا دکھا کر چھپا دیا گیا ہو۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم وہاں اپنا بزنس سنبھالتے رہنا اور میں سلم ہیلتھ کلینک چلی جاؤں گی۔"

میں حیرت سے اچھل پڑا "سلم ہیلتھ کلینک..... وہاں تمہارا کیا کام.....؟" مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا تھا۔

"ہر سال میری ممی ہم تینوں بہنوں کو لے کر وہاں جاتی ہیں۔ ڈاکٹر گھنشام ہمارا خاص خیال رکھتے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسی "موٹی لڑکیاں دیکھنے میں عورتیں لگنے لگتی ہیں نا۔ اسی ہیلتھ کلینک میں ہر سال جانے کی وجہ سے ہی تو ہم تینوں بہنیں اتنی..... میرا مطلب ہے کہ....."

میں چکرا کر رہ گیا۔ عجیب مشکل تھی۔ میں جتنا ان تینوں بہنوں کو کیس سے الگ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنا ہی اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا جاتا تھا۔ تاہم میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔ چیف کی بات کا مجھے اب بھی یقین نہ آیا تھا۔ اسے ابتدا ہی سے پنجوانی سسٹرز پر شبہ تھا۔

ایئرپورٹ پر ایک خصوصی طور پر چارٹر کیا جانے والا جہاز' ہمارے لئے تیار کھڑا تھا اور سوئٹزرلینڈ کے مار ملیڈ ہوٹل میں "مسٹر فراز اور بیگم فراز" کے لئے ایک کمرہ حسب سابق ریزرو تھا۔

سوئٹزرلینڈ میں زیرو ایلس کا مقامی چیف ور بلن تھا لیکن اس کی شکل اداکار جیری لوئس سے ملتی جلتی تھی۔

"مسٹر شہباز....." اس کی آواز بھی جیری لوئس کی طرح ملتی تھی۔ "دراصل میرے پاس "سلم ہیلتھ کلینک" سے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ وہاں ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ دنیا کے امیر ترین لوگ..... جو دولت کے عوض اپنی صحت ٹھیک رکھ سکتے ہیں۔"

ور بلن کے پاس سلم ہیلتھ کلینک کے اندرونی حصے کی کوئی تصویر نہ تھی۔ اس نے وہ سینٹر بھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس ڈاکٹر گھنشام کی بھی کوئی تصویر نہ تھی۔ مجھے اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گھنشام باہر نہیں نکلتا۔ اس کے مریضوں کے علاوہ کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ مجھے ور بلن سے مل کر مایوسی ہی ہوئی۔ وہ معلومات جو اس نے فراہم کی تھیں۔ یہ سب کچھ تو میں قصبے کے کسی بھی شہری سے حاصل کر سکتا تھا۔

اس کے باوجود میں نے مسکرا کر ان قیمتی معلومات کی فراہمی کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا جس پر اس نے کہا یہ تو اس کا اخلاقی فرض تھا۔

میں ور بلن کے دفتر سے نکلا تو باہر ہوا خنک تھی اور فضا میں ایک عجیب سی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں پیدل ہی ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ ایک شاپنگ سینٹر کے پاس جب میں سڑک پار کرنے لگا تو ایک سیاہ کار میرے پاس آ کر رکی پانچ ہٹے کٹے جوان اس میں سے اترے اور مجھ پر پل پڑے۔ ان کا یہ اقدام میری توقع کے خلاف تھا۔ میں نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی مگر اسی وقت کئی گھونسے میرے منہ' پیٹ اور پسلیوں پر پڑے۔

میں لڑکھڑاتا ہوا ان کی کار سے جا لگا۔ طاقتور گھونسے مجھ پر وزنی ہتھوڑوں کی مانند برسنے لگے۔ ہر گھونسہ پہلے سے زیادہ زوردار اور بھرپور تھا۔ میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور ان کی کار سے پشت لگائے میں آہستہ آہستہ ترچھا ہو کر پھسلتا گیا اور پھر زمین پر جا گرا۔ زمین پر گرتے ہی میں

ساکت ہو گیا تھا۔ دیر تک وہ نامعلوم حملہ آور میرے ارد گرد کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے دانستہ سانس روک لیا تھا۔

"بے ہوش ہو گیا ہے۔" ان میں سے ایک حقارت سے بولا "گاڑی میں ڈال دو اٹھا کر۔"

حکم دینے والے نے ہی آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ باقی چاروں نے اس کے حکم کی تعمیل میں مل کر مجھے اٹھایا اور کار کی سمت لے چلے۔ وہ مجھے واقعی بے ہوش ہی سمجھ رہے تھے آنکھ کی جھری میں سے میں کار کے کھلے دروازے کو قریب آتے دیکھتا رہا۔

معاً میری ٹانگ چلی اور کار کا دروازہ اُن میں سے ایک کے سر پر جا لگا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی تو باقی کی گرفت مجھ پر ہلکی پڑ گئی۔ میں تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل گیا۔ میرا پہلا گھونسہ جس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ خاموشی سے زمین پر ڈھیر ہو گیا ان میں سے ایک فوراً سنبھلا اور ریوالور نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر میں ہوشیار تھا اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکال لینے میں کامیاب ہوتا میری لات اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ درد سے تڑپتا' کراہتا' تلملاتا ہوا زمین پر گر گیا۔

باقی تینوں کار کے پیچھے پناہ لینے کے لئے بھاگے۔ میں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ان کا تعاقب کرنے کی بجائے میں خود بھی دوسری کاروں کی آڑ لیتا ہوا پیچھے بھاگا۔ میں ایک کار کی آڑ لے کر دوسری گاڑی کی جانب لپکا ہی تھا کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ انہوں نے کار کے پیچھے پہنچتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

****

گولیاں میرے آس پاس سے گزرتی چلی گئیں مگر میں اندھا دھند بھاگتا گیا حیرت زدہ دکان داروں اور خوفزدہ گاہکوں نے مجھے ریوالور ہاتھ میں لئے بھاگتے دیکھا۔ کئی خواتین نے چیخیں ماریں اور بے ہوش ہو کر گر پڑیں لیکن میں سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ میں دوبارہ ان نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھ پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ ٹریفک رک گیا تھا اور لوگ شتر بے مہار کی مانند' ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

یہ صورتحال میرے حق میں مفید تھی۔ جب کہ حملہ آوروں کے حق میں ناساز گار۔ انہوں نے فائرنگ بند کر دی اور کار میں بیٹھ کر بھاگ لئے۔

****

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور سلم ہیلتھ کلینک کی سفید عمارت پر ایک نظر ڈالی۔

عمارت ایک اونچی سی پہاڑی پر واقع تھی اور ایک پتلی سی سڑک' سانپ کی طرح بل کھاتی اوپر جاتی تھی۔ میں نے دوربین فوکس کی اور سڑک کو دیکھنے لگا جو زمین سے بتدریج بلند ہوتی جاتی تھی اور ایک فولادی گیٹ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں مسلح محافظوں کے سروں کے عین اوپر "سلم ہیلتھ کلینک" کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا اور دور سے بھی انتہائی صاف طور پر دکھائی دیتا تھا۔ اچانک میری نگاہ سیاہ رنگ کی ایک کار پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا بلاشبہ یہ وہی کار تھی جس میں وہ نامعلوم حملہ آور سوار ہو کر آئے تھے۔

گیٹ پر موجود محافظوں نے ہارن کی آواز سن کر دروازہ کھولا اور ایک زناٹے کے ساتھ کار اندر داخل ہو گئی۔ میں اپنی جگہ مبہوت کھڑا اس کار کو کلینک کے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ بیک وقت کئی سوال اور اندیشے میرے ذہن میں ابھر آئے تھے۔

میں ان حملہ آوروں سے قطعی ناواقف تھا لیکن جس انداز میں بھرے بازار میں انہوں نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جس نے بھی انہیں اس مشن پر بھیجا تھا پہلے میرے بارے میں خوب اچھی طرح بتا دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر میرا وہ دشمن کون تھا؟ اور میری آمد کی خبر اس تک کیسے پہنچ گئی تھی؟ کار جس انداز میں سلم ہیلتھ کلینک کی عمارت میں داخل ہوئی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ میرے لئے یہ دعوت نامہ ڈاکٹر گھنشام نے بھیجا تھا۔ سواری اور خاطر تواضع کے بہترین انتظام کے ساتھ۔ خود میں نے ہی انتہائی ناشائستہ انداز میں اس کی دعوت ٹھکرا دی تھی۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ڈاکٹر گھنشام کو مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ میں نے تو آج تک اُسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ بالفرض

محال اگر وہ میرا دشمن تھا تو میری آمد کی خبر اس تک کیسی پہنچ گئی؟ صفیہ کے ذریعے یا پھر وربلن کے توسط سے میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ آخر وہ کون ہے جس کے دماغ میں کمپیوٹرائزڈ ڈسک لگی ہوئی ہے؟

مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ اس دیار غیر میں میرے دشمن کتنے ہیں؟ ایک یا ایک سو۔۔۔؟ یا پھر ایک ہزار......؟ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ آخر یہ لوگ جن سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا جنہیں میں نے دیکھا تک نہیں تھا وہ لوگ میری جان کے در پے کیوں ہو گئے تھے؟

میں صفیہ کے کمرے میں گیا تو وہاں ایک عجیب صورتحال میری منتظر تھی۔ ایک کرسی پر صفیہ بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھی اس کے ساتھ ہی صفیہ۔۔۔ مگر نہیں...... یہ صفیہ تو نہ تھی۔ شاید اس کی بہن تھی۔ تیسری بہن ایک صوفے پر نیم دراز تھی۔ نادیہ، سعدیہ اور صفیہ تینوں ہم شکل بہنیں ایک ساتھ تھیں جب کہ ان کی ماں بائیں طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔

تینوں بہنوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک ہی لڑکی کو تین شیشوں میں دیکھ رہا ہوں۔ انہیں الگ الگ پہچان لینا بہت مشکل تھا اتنا ہی دقت طلب کام جتنا کہ چھلنی میں پانی جمع کرنا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا" بولنے والی غالباً صفیہ تھی کہ میں اور میری بہنیں، ممی کے ساتھ ہر سال "سلم ہیلتھ کلینک" میں آتی ہیں۔ یہ دونوں اور ممی یہاں پہلے سے ہی پہنچی ہوئی تھیں۔"

صفیہ کو لے کر موناکو فرار ہو جانے کے جرم میں مجھے ان چاروں ماں بیٹیوں نے ایک سزا تجویز کی۔ یہ تجویز کردہ سزا "گرین وڈ ریسٹورنٹ" میں ڈنر کھلانے کی تھی جو میں نے انتہائی خوشی کے ساتھ قبول کرلی۔ زیرو ایکس کی طرف سے رقم کی فراہمی کے بعد یہ سزا، سزا نہیں رہی تھی۔ جب کہ عام حالات میں میں اس اعلیٰ اور نفیس ریسٹورنٹ میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں داخلے کے حقوق محفوظ تھے۔

پنچوانی فیملی کا تعلق عام لوگوں میں نہیں ہوتا تھا۔ گرین وڈ ریسٹورنٹ میں ان کے گرد وی آئی پی قسم کے لوگ جمع ہوتے گئے۔ ہر شخص ان کے قرب کا خواہاں تھا۔ مجھ پر بے زاری سی طاری ہو گئی۔ میں خود کو یکایک تنہا محسوس کرنے لگا اس سے پہلے کہ میری تنہائی مجھے بوکھلا دیتی ایک نوجوان لڑکی اندر آئی اور خاموشی سے ایک خالی میز پر بیٹھ گئی۔

لمحہ بھر کے لئے ڈائننگ ہال میں موجود ہر شخص کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے حسن نے سب کو مسحور کر دیا تھا۔ تینوں بہنوں میں سے ایک نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "اوہ! یہ لڑکی تو غالباً سلم ہیلتھ کلینک میں کام کرتی ہے۔"

میں نے اس لڑکی کو نظرانداز کر دیا تھا مگر اس انکشاف کے بعد اس لڑکی میں میری دلچسپی بڑھ گئی اس دلچسپی کی دو وجوہ تھیں پہلی تو یہ کہ وہ سلم ہیلتھ کلینک میں کام کرتی تھی اور دوسری بات یہ کہ وہ بے حد خوبصورت بھی تھی۔

ڈنر ختم ہوا تو ہم واپسی کی تیاری کرنے لگے اس لڑکی کی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر اس پر ڈالی

خلاف توقع وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی اس نے مجھے ایک عجیب سا اشارہ کیا تھا اور سر جھکا کر اپنے سامنے، میز پر رکھا ہوا کافی کا مگ اٹھا لیا۔ میں حیرت زدہ اور بھونچکا رہ گیا تھا۔ میں نے احمقانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ تینوں بہنیں مجھ سے آگے جا رہی تھیں اور اپنی ماں سے باتیں کرنے میں الجھی ہوئی تھیں ورنہ وہ اس اشارے کو ضرور سمجھ لیتیں اور شاید وہیں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ان چاروں کو ان کے کمروں تک پہنچایا اور واپس ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑا۔ وہ بھی اسی ہوٹل میں قیام پذیر تھیں جہاں میں صفیہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ہوٹل سے نکلا تو باہر بارش شروع ہو گئی تھی اور ہوا میں خاصی تندی تھی۔ تیز ہوا کے باعث بارش کے قطرے منہ پر تیزی کے ساتھ پڑتے تو سردی کے ہلکے سے احساس سے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی۔

میں نے ہیٹ اپنے منہ پر جھکایا اور دیواروں کی آڑ لیتا ہوا چلتا چلا گیا۔ ریسٹورنٹ میرے رہائشی ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ریسٹورنٹ میں وہ اب تک اسی میز پر بیٹھی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہو گیا اور

آنکھوں سے جھانکتی پریشانی معدوم ہو گئی ۔ میں کرسی گھسیٹ کر بلا تکلف اس کے قریب بیٹھ گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرے لئے اجنبی نہ ہو۔

"مسٹر فراز ....." اس نے اپنا نرم و نازک' خوبصورت ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "میں سوزان ہوں۔"

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں چونک پڑا۔ اس نے جس طرح میرا نام لیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے پہلے سے جانتی تھی۔

"مجھے غلط مت سمجھئے گا مسٹر فراز ..... میں اس طرح اجنبی مردوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتی مگر..... مگر بات ہی ایسی ہے۔" اس نے خوفزدہ نظر سے ادھر ادھر دیکھا۔ "دراصل میں ..... میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن یہاں نہیں ..... یہاں کوئی بھی ہماری باتیں سن سکتا ہے جب کہ میں نہیں چاہتی ..... یہ بات کسی اور کے کانوں تک جائے۔"

اس کے لہجے میں ایک لمحے کے لئے جھجھک سی پیدا ہو گئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی "مسٹر فراز! آپ کے پاس کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے جہاں ..... میرا مطلب ہے ..... جہاں ہم کھل کر بات کر سکیں۔ نہ جانے کون یہاں پر نگرانی کر رہا ہو۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟ تاہم میں نے اسے اپنے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ فوری طور پر صفیہ میرے کمرے میں نہیں آئے گی۔ وہ یقیناً اپنی ماں اور بہنوں سے گفتگو کرنے میں مصروف ہو گی۔ میں اس مہلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی' اسے توجہ سے سن سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی باتوں کی روشنی میں مجھے پیشرفت کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔

"اب تم باہر چلے جاؤ مسٹر نواز....." اس نے پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی ۔ وہ انتہائی محتاط تھی۔ "میں کچھ دیر میں آؤں گی تاکہ ..... تاکہ کوئی ہم دونوں پر شبہ نہ کر سکے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ باہر بارش بدستور جاری تھی۔ میں ایک نیم تاریک جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ بھی تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ میں اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور روشنی میں آ گیا تاکہ اسے مجھے ڈھونڈنے میں دشواری نہ ہو۔ ہوٹل تک ہم بارش میں ساتھ ساتھ بھیگتے چلے گئے۔

میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ شاید راستے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے چپ دیکھ کر مجبوراً مجھے بھی خاموش رہنا پڑا۔

****

میں جب باتھ روم جانے کے لئے اٹھا تو اچانک سوزان کے ہاتھ کی انگوٹھی میرے بازو سے ٹکرائی۔ اس وقت وہ انگڑائی لے رہی تھی شاید۔ انگوٹھی کی نوک اچانک چبھی تو مجھے ایسا لگا جیسے میری کھال بھی چھل گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اسے ایسی نوکدار انگوٹھی پہننے کی کیا ضرورت تھی؟ بستر سے اتر کر جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو پورا کمرہ میری نظروں کے سامنے' بحری جہاز کی مانند ہچکولے لینے لگا۔

"شراب کا اثر ہے یہ شاید ....." میں نے سوچا مگر فوراً ہی اس خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا ...... شراب تو میں نے خاصی دیر سے نہیں پی تھی۔

ذرا دیر میں ہی کمرا اچانک الٹا ہو گیا۔ دور کہیں تیزی سے ڈرم بجنے لگے جن کی آواز رفتہ رفتہ میری کنپٹیوں میں اتر گئی ۔ اب ڈرم میرے کانوں کے نزدیک بج رہے تھے۔ میں نے گردن جھٹکی اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میری نظروں کے سامنے سب کچھ دھندلا پڑ گیا تھا صرف ہیولے تھے جو آنکھوں کے سامنے رقصاں تھے اور یہ ہیولے بتدریج اپنا حصار میرے گرد تنگ کرتے جا رہے تھے۔

شاید میں بے ہوش ہونے والا ہوں ..... میں نے سوچا ..... مگر کیوں؟ ذرا دیر قبل تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر مجھے انگوٹھی کی خراش یاد آئی تو گویا یہ سوزان ہی تھی جس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ گرنے سے قبل میں نے پلٹ کر اور آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لئے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا جی چاہا' آگے بڑھ کر اس کا حلق دبا دوں لیکن اپنی اس خواہش کو

جاسوسی نشست

کینسر

روحانی لمحوں میں لڑکی نے اپنے محبوب سے جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا کہا۔
"اُف! شام کے اس وقت کی کرنوں نے بادلوں میں کیسے کیسے رنگ بکھیر دیے ہیں۔ ذرا اس لپکتے ہوئے اُودے رنگ کو دیکھو کیا انوکھا معلوم ہو رہا ہے۔"
ڈاکٹر نے گہری توجہ سے بادلوں کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر لڑکی سے کہنے لگا۔
"ہاں واقعی! یہ رنگ بڑا انوکھا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ تو بالکل کینسر کا مارا ہوا پھیپھڑا معلوم ہو رہا ہے۔"

ناول ملکیت و سکیننگ: ڈاکٹر حامد حسن نسرین جبیں۔ لاہور

مسکراہٹ منجمد تھی۔

لفٹ رکی اور دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے ایک وسیع ہال دیکھا جس کی دیواریں شیشے کی تھیں اور باہر پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی ہوئی برف سے منعکس ہونے والی سورج کی روشنی کمرے کو منور کر رہی تھی۔ شفاف شیشے کی نازک دیواروں سے سوئٹزر لینڈ کی خوبصورت وادیاں نظر آ رہی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑا سا کمپیوٹر لگا ہوا تھا جس سے نامانوس عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں اس کمپیوٹر نما مشین کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اتنا بڑا اور انتہائی پیچیدہ کمپیوٹر میں نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چاروں آدمیوں نے مجھے اس کمپیوٹر نما مشین کے پاس لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور میرے سر، ہاتھوں اور پیروں میں شکنجے کس دیئے۔ ڈاکٹر گھنشام کی جنبش ابرو پر وہ چاروں کمرے میں سے نکل گئے۔ انتہائی خاموشی کے ساتھ اب اس وسیع و عریض ہال میں میرے علاوہ صرف سوزان اور ڈاکٹر گھنشام تھے۔ ان کے سپاٹ چہرے دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی۔

****

"یہ ہے وہ چیز مسٹر شہباز ..." ڈاکٹر گھنشام نے فخریہ انداز میں کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی میں تاریکی ایک لہر کی طرح مجھ پر چھا گئی۔ میں لڑکھڑایا اور بے جان انداز میں فرش پر گر پڑا۔ مجھے اپنے جسم پر ذرا بھی کنٹرول نہیں رہا تھا۔

آنکھ کھلی تو تیز سفید روشنی مجھ پر پڑ رہی تھی اور میری جلد کو جھلسائے دے رہی تھی۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر آواز میرے حلق سے نہ نکلی۔

سفید کپڑوں میں ملبوس چار آدمیوں نے مجھے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ میں اب تک فرش پر ہی پڑا ہوا تھا۔ میرے بالکل سامنے دو آدمی تھے سفید گاؤن میں ڈھکے ہوئے۔ میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا ...... ایک تو دراز قامت سوزان تھی۔ سفید لباس میں وہ کسی ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔ دوسرا شخص میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور اس کے چہرے پر جو عزم جھلک رہا تھا وہ معذوروں والی وہیل چیئر کے ساتھ بالکل مصنوعی لگتا تھا۔

سوزان نے سپاٹ نظروں سے مجھے ہوش میں آتے دیکھا اور پلٹ کر دور جا کھڑی ہوئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ میں یقیناً سلم ہیلتھ کلینک میں تھا اور وہ بوڑھا شخص جو میرے سامنے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا یقیناً ڈاکٹر گھنشام تھا۔

"سلم ہیلتھ کلینک میں تمہاری تشریف آوری کا شکریہ مسٹر شہباز" ڈاکٹر گھنشام نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کے لہجے میں جو زہریلا پن چھپا ہوا تھا وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میرے جسم کی فصیل پر حیرت کے بھالے برس اٹھے۔

اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا بلکہ اچھلنے کی کوشش کی مگر چمڑے کے مضبوط فیتوں نے مجھے اچھلنا تو درکنار، حرکت بھی نہ کرنے دی۔

ڈاکٹر گھنشام نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر میری اس جدوجہد کو دیکھا پھر ان چاروں آدمیوں کو کوئی اشارہ کیا جو دیوار کے قریب کھڑے ہوئے تھے ان چاروں نے مجھے اٹھایا اور ایک لفٹ کی طرف لے چلے۔ میں نے حرکت میں آنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ڈاکٹر گھنشام اپنی وہیل چیئر پر ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اب تک طنزیہ

"یہ وہ کمپیوٹر ہے جس نے دنیا بھر میں عموماً اور اسلامی دنیا میں خصوصاً تباہی و بربادی مچا رکھی ہے۔"

اس کے اشارے پر سوزان کمپیوٹر کے مختلف رنگ کے بٹن دبانے' باہر نکلے ہوئے ہینڈلوں کو اونچا نیچا کرنے اور سنہری لٹووں کو گھمانے لگی۔ سوزان کا ہاتھ رکتے ہی ایک بڑی اسکرین پر مختلف ہندسے اور اشکال بننے بگڑنے لگیں۔ مجھے سب کچھ اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔

"تم کون ہو" میں نے بے تابی سے پوچھا "اور یہ سب کیا چکر ہے؟"

ڈاکٹر نے پھرتی سے اپنی کرسی گھمائی اور میرے سامنے لا کھڑی کی۔ اس کی کرسی یقیناً آٹومیٹک تھی جو کرسی کے ہتھوں پر موجود' رنگ برنگے بٹنوں کو دبانے سے چلتی تھی۔ وہ ان بٹنوں کی مدد سے جس طرف چاہتا' بڑی آسانی سے اپنی کرسی کو آگے پیچھے بڑھا سکتا تھا اور دائیں بائیں گھما سکتا تھا۔ میرا سوال سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی چمک ابھر آئی تھی۔

"لوگ مجھے ڈاکٹر گھنشام کے نام سے جانتے ہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مگر میں تمہیں اپنا اصلی نام بتاؤں گا میرا نام صفدر ہنجوانی ہے۔ میرے اجداد کا تعلق دہلی سے ہے۔"

یہ انکشاف میرے لئے حیران کن تھا۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا اور آنکھوں سے بے یقینی جھلکنے لگی۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر شہباز" اس نے میری حیرانی بھانپ لی تھی "تم تو میری تینوں لڑکیوں اور بیوی سے واقف ہو نادیہ' سعدیہ اور صفیہ.... تینوں میری ہی بیٹیاں ہیں مگر یہ ایک غیر متعلق بات ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکا "پہلے یہ جان لو مسٹر شہباز کہ تم اس وقت مکمل طور پر میرے کنٹرول میں ہو۔ جسمانی طور پر۔ کچھ دیر میں تم ذہنی طور پر بھی میرے کنٹرول میں ہو جاؤ گے۔"

مجھ پر اس کی بات سن کر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ مجھے ایک ہوش مند شخص کم اور جنونی زیادہ نظر آ رہا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ تم ذہنی طور پر میرے کنٹرول میں آ جاؤ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے مجھے انسانی ذہن پر کنٹرول کے بارے میں ریسرچ کرنے کو کہا۔ پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ اگر میں اپنے تجربے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بھارت کے ہر مسلمان ذہن کو اپنے کنٹرول میں لے کر انہیں ہندو مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ اس کا اگلا ہدف پاکستانی سیاستدان اور فوجی آفیسر ہوتے۔"

"۱۹۵۰ء تک میں جانوروں اور پرندوں کے ذہنوں پر تجربات کرتا رہا۔ کبھی دماغ کے آپریشن.... کبھی کیمیائی اجزاء کے ذریعے دماغ میں تبدیلی۔ ابھی کامیابی کی منزل خاصی دور تھی کہ مجھے کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا گیا' جہاں پاکستان مستقل پیشقدمی کر رہا تھا۔"

اس نے اپنے ہاتھوں سے دستانے ہٹائے۔ تھوڑی دیر میں اس کے دونوں بازو' کندھوں سے علیحدہ ہو کر فرش پر گر پڑے۔

"میرے دونوں بازو' پاکستانی توپوں سے نکلنے والا ایک گولہ لے گیا۔ ان بازوؤں کو جو نہ جانے کیا کیا تخلیق کر سکتے تھے۔" وہ کرب بھرے انداز میں ہنسا۔ "پھر بھارت میں عراق کے ایجنٹ' شکاری کتوں کی طرح سونگھتے ہوئے آئے اور مجھے اپنے ساتھ عراق لے گئے۔ میری شہرت بہت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ عراقی ایجنٹ مجھے کشمیر کے محاذ جنگ سے ہی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ بھارت کے پنڈت جواہر لعل نہرو کو میرے اس طرح غائب ہو جانے کے بعد میری موت کا یقین ہو گیا تھا۔" وہ ذرا سی دیر کیلئے سانس لینے کی خاطر رک گیا۔

میں خاموش اور بے حرکت' پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

****

"عراق میں بھی میں نے اپنا کام جاری رکھا' عراقیوں نے میرے لئے مصنوعی بازو اور ہاتھ بنا دیئے تھے جو بالکل اصلی ہاتھوں کی مانند کام کرتے تھے۔ انہیں لگانے کے بعد مجھے احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ میں اپنے بازوؤں اور ہاتھوں سے محروم ہو چکا ہوں۔"

"کامیابی آہستہ آہستہ میرے قریب آتی گئی۔ عراقی سیکرٹ سروس اور عراقی حکومت مجھ پر کڑی نظر رکھ رہی تھی۔ فطری طور پر میری ہمدردی اور وفاداری اب بھی بھارت

کیلئے وقف تھی کیونکہ میں نے اسی دھرتی سے جنم لیا تھا اور عراقی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ میری ریسرچ کے نتائج کے بعد مجھے فرار ہونے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔"

اس نے اپنی ٹانگوں کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور اس کی دونوں ٹانگیں فرش پر دور تک پھسلتی چلی گئیں۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ میں بولنا چاہتا تھا لیکن کچھ بول نہ پایا۔

"انہوں نے میری دونوں ٹانگیں کاٹ دیں تاکہ میں فرار نہ ہو سکوں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آگئی تھی۔ "پھر مجھے ایک تنہا مقام پر قید کردیا گیا جہاں میں نے کام کے دوران برسوں کسی کی شکل نہ دیکھی۔ کوئی لفظ میرے کانوں نے نہ سنا اور کوئی قہقہہ میری سماعت سے نہ ٹکرایا۔ اس تنہا مقام پر مجھے صرف ریسرچ کرنی تھی۔ میں انسانی ذہن کو کنٹرول کرنے کیلئے ریسرچ کرتا رہا اور پھر ایک روز سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب بپا ہوگیا۔ سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں نے دو نام سنے "کمپیوٹر اور منی ایچر ٹرانزسٹر"۔ یہ دونوں چیزیں میری اپنی ایجاد تھیں اور مستقبل میں میری کامیابی کی ضامن...." اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

میں بدستور اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ وہیل چیئر پر وہ بغیر بازوؤں اور ٹانگوں کے عجیب سا لگ رہا تھا۔

"میں نے جان لیا تھا کہ اگر ایک منی ٹرانزسٹر انسانی دماغ میں لگا دیا جائے اور کمپیوٹر سے اسے کنٹرول کیا جائے تو وہ دماغ، کمپیوٹر کی ہدایات کی اطاعت کرے گا۔ اس کی اپنی قوت ارادی جب جی چاہے ختم کی جاسکتی تھی۔ ان ہی دنوں چین کا ایک سائنس دان عراق پہنچا۔ اس نے ان کے ڈائریکٹر سے ایک خفیہ ملاقات کی اور چند روز بعد میں چین آگیا۔ انہوں نے میرے بازو اور ٹانگیں علیحدہ کردیں اور مجھے سائنسی آلات کے ایک کریٹ میں بند کرکے چین اسمگل کردیا۔ عراقیوں کو گمان بھی نہ گزرا کہ میں ان کی دسترس سے باہر جاچکا ہوں۔

"چین میں جہاں مجھے عزت، دولت اور اعلیٰ مرتبہ ملا وہیں مجھے بچھڑی ہوئی بیوی اور بچے ملے۔" ادھورے جسم والا شخص بولا۔ "میں نے ان سب کو بنگلہ دیش بھجوا دیا۔

اب میری کامیابی بے حد قریب تھی مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دماغ کے اندر وہ مائیکرو اسکوپک ٹرانزسٹر کس طرح داخل کروں؟ دن رات کی کاوش اور غور و فکر کے بعد ایک طریقہ میری سمجھ میں آگیا۔"

وہ ایک مکمل انسان کی مانند مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ خاصی جاندار تھی۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ طریقہ کیا تھا؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ میری بے تابی اور اشتیاق دیکھ کر ہنس دیا۔ "ایکوپنکچر کے ذریعے۔۔۔ چین کے قدیم طبی طریقے ایکوپنکچر کے ذریعے۔" اس نے بتایا۔ "پہلا تجربہ میں نے چینی کمیونسٹ پارٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار پر کیا۔ اس کی مدد سے میں چین سے فرار ہوا اور سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا وہ اعلیٰ عہدیدار واپس چین جاتے ہوئے ایک جہاز کے حادثے میں مارا گیا اور میں نے ایک نئے نام سے ایک نئی زندگی کی ابتدا کردی۔ میری بیوی نے مجھے چوری چھپے سرمایہ فراہم کیا اور میں نے ڈاکٹر کنفشام بن کر سلم ہیلتھ کلینک کھول لیا۔

مریضوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ دنیا بھر کے وزیر، سفیر اور فوجی آفیسر سب یہاں آنے لگے اور میں ان کے دماغوں میں ٹرانزسٹر فٹ کرتا گیا۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ عراقی حکومت نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا اس کے ردعمل کے طور پر مجھے پوری دنیا کے انسانوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ جس طرح میں بے دست و پا کردیا گیا تھا اب اسی طرح میں دنیا کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن مسلمان ہونے کے باوجود فطری طور پر یہ نفرت مجھے مسلمانوں سے زیادہ تھی اور اب بھی ہے میرا اب کسی دین یا دھرم پر عقیدہ نہیں رہا تھا۔

"میں دنیا بھر کی حکومتوں پر اپنا قبضہ جماتا گیا پنڈت جواہر لعل ہندو کا دوست۔۔۔ بھارت جیسے بڑے ملک کا باسی ڈاکٹر صفدر پنجوانی۔۔۔" اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔

"دنیا کے چپے چپے میں، خفیہ کانفرنسوں میں، سربراہوں کی ملاقاتوں میں، جنگی و اقتصادی اجلاسوں میں، ہر جگہ اب ڈاکٹر پنجوانی کے مخبر موجود ہیں جو تمام معلومات اپنے ذہن

کے ذریعے مجھے ارسال کر دیتے ہیں۔ وہ میرے دیئے ہوئے ہر حکم پر "لیس سر" کہتے ہیں۔ خواہ ان کی حیثیت اپنے ملک میں کچھ بھی کیوں نہ ہو" بولتے بولتے اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔

میرا چہرہ بے یقینی کی کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا اور آنکھوں سے بے اعتباری عیاں تھی۔

****

"تم ... تم سمجھ رہے ہو کہ میں پاگل ہوں ... بکواس کر رہا ہوں" وہ یک دم غصے میں آگیا اور اس نے سوزان کو جنبش ابرو سے کچھ اشارہ کیا۔ وہاں موجود شاید ہر شخص اس کے اشاروں کا مطلب سمجھتا تھا۔ سوزان نے خاموشی سے ایک بٹن دبا دیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین روشن ہو گئی تھی۔

بٹن دبتے ہی خفیہ اسپیکروں سے گفتگو کی آواز ابھرنے لگی۔ دو افراد باہم گفتگو کر رہے تھے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آواز امریکہ کے صدر کی تھی۔ وہ کسی سے افغانستان کی خانہ جنگی اور عراق پر اقتصادی پابندیاں لگانے کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔ پھر کوئی روسی زبان میں بولنے لگا۔ یہ روس کا صدر تھا جو ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی روک تھام کی بات کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صرف اسی طرح ورلڈ بینک اور دنیا کے دیگر ممالک سے بھاری قرضہ جات لے کر ملک کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو سنبھالا دیا جا سکتا ہے پھر فرانس کا وزیراعظم' برطانیہ کا وزیراعظم' بھارتی صدر' سعودی شاہ' مصری صدر اور پاکستان کی ایک مقبول شخصیت کی آواز سنائی دی۔ اسے تشویش تھی کہ حکومت پاکستان اس کی تنظیم کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک کر رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر رہا تھا کہ اس سلسلے میں عالمی ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک ایک کر کے مختلف ممالک کے انتہائی اہم افراد کی آوازیں آتی گئیں اور میں حیران بیٹھا سنتا رہا۔ یہ دنیا کی سب سے عجیب و غریب ایجاد تھی۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ یقیناً ایسے ہی ٹرانزسٹر ایجنٹ سجاد' بھارتی سفیر کے دماغ میں اور نہ جانے کس کس کے دماغ میں نصب تھے۔

"سکندر اعظم پوری دنیا کو ہتھیاروں کے زور پر فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔" اس نے چلا کر کہا۔ "مگر میں ساری دنیا کو فتح کر چکا ہوں۔ میں دور کا سکندر اعظم ہوں۔ سکندر ثانی۔ جس لمحے بھی اندازہ ہو گیا کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں' اسی سے میرا اقتدار شروع ہو جائے گا۔ میں جو چاہوں گا کر کیونکہ دنیا میری تابع ہو گی اور انسانوں کے اندر پوشید میرے اطاعت گزار ہوں گے۔ آئی ایم دی ماسٹر آف ورلڈ مسٹر شہباز ..." اس کا چہرہ شدت جذبات سے سر رہا تھا۔

"جہاں تک تمہارا تعلق ہے ...." اس نے مجھ "تمہارے دماغ میں بھی ٹرانزسٹر لگا دیا جائے گا.... بے ہوشی کے دوران۔ اب میری معاون کمپیوٹر کے ذریعے اس ٹرانزسٹر کو آن کرد پاکستانی سیکرٹ سروس "زیرو ایکس" کا مشہور سیکرٹ شہباز بھی میرے تابعداروں کی صف میں شامل ہو گا۔" اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ شاید میر بسی پر۔

وہ یقیناً بے انتہا اعتماد کا مالک تھا۔ آدھے شیطان۔ پسینہ میرے جسم سے پھوٹ نکلا اور خوف سوئیاں میری آنکھوں میں چبھنے لگیں۔

ڈاکٹر صفدر پنجوانی نے پلٹ کر سوزان کو کوئی اشارہ کیا ا وہ کوئی جواب دیئے بغیر جھکی اور تیزی سے کمپیوٹر کے ڈائل پر نصب چھوٹے چھوٹے ان گنت بٹن دبانے شروع کر دیئے۔ کمپیوٹر سے عجیب سی آوازیں ابھرنے لگیں۔ یہ آوازیں پہلی والی آوازوں سے مختلف تھیں پھر ڈائل پر بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ میں کرسی پر بے بسی سے بندھا بیٹھا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

"کیا ہو گا اب....؟" میں نے سوچا۔ "کیا میری سابقہ یادداشت کھو جائے گی یا کوئی نیا ماضی مجھے یاد کرا دیا جائے گا؟"

میں کرسی پر مضبوط شکنجوں میں جکڑا ہوا کچھ ہونے کا منتظر بیٹھا رہا۔ ڈائل پر بجلیاں کوندنی بند ہو گئیں۔ اب تک تو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری شخصیت میں ہر چیز پہلے ہی کی طرح موجود تھی۔ مجھے اپنے ماضی کی ہر بات اچھی طرح یاد تھی۔

"سیکرٹ ایجنٹ مسٹر شہباز کے دماغ میں نصب شدہ

ں کر دیا گیا ہے ڈاکٹر صفدر۔۔۔" سوزان سپاٹ لہجے
از ایسا ہی تھا جیسے کوئی روبوٹ بات کر رہا ہو۔
زان کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے انسان کم اور
ہ نظر آئی۔
کے عالم میں کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔
ت میں نے انتہائی حیرت سے سنی تھی۔ مجھے کچھ
ہیں ہوا تھا۔ میرا دماغ کنٹرول میں تھا اور میں
سکتا تھا۔ ڈاکٹر صفدر نے پھر قہقہہ لگایا۔ میں
ے پر بے بسی کا تاثر سجالیا اور سامنے والی دیوار
بغیر گھورتا رہا تاکہ اسے یقین آجائے کہ
کے ٹرانزسٹر نے کام کرنا شروع کردیا ہے تاہم
چ رہا تھا کہ یا تو سوزان سے بٹنوں کے
ں ہوگئی تھی یا پھر کمپیوٹر میں ہی کوئی خرابی
تھی جس کا دونوں ہی کو علم نہ ہو سکا تھا۔ شاید
یاوری کر رہی تھی۔

پھر کامیاب ہو گیا ہوں۔" اس نے سرمستی کے
دو سے کہا۔ "ہمیشہ کی طرح میں پھر کامیاب ہو گیا
س نے ہذیانی انداز میں اپنی کامیابی پر قہقہہ لگایا اور
واشارہ کیا "اب اسے آزاد کردو۔"

ان قدم بہ قدم آگے بڑھی، میرے نزدیک آئی اور
شکنجے کھولنے شروع کردیئے۔ میں نے اپنے ہاتھ پر
ے ہاتھ کا نازک سا دباؤ ایک لمحے کو محسوس کیا۔ اس
ے دباؤ میں گرم جوشی، خلوص اور چاہت شامل تھی۔
وں بعد ہی میں آزاد ہو چکا تھا۔

سوزان مجھ سے کوئی بات کیے بغیر واپس پلٹی اور دوبارہ
یوٹر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میرا دماغ بالکل
ٹھیک تھا اور میں آزاد بھی ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر صفدر
وانی سمجھ رہا تھا کہ میں ذہنی طور پر اس کے کنٹرول میں
وں، خواہ کہیں بھی چلا جاؤں اور پھر سوزان کے ہاتھ کا ہلکا
سا دباؤ۔ مجھے اب تک اندازہ نہ ہو پایا تھا کہ اس نے یہ دباؤ
میرے ہاتھ پر کیوں ڈالا تھا؟ شاید اس نے ٹرانزسٹر کو آن ہی
نہیں کیا تھا۔

اسی لمحے ڈاکٹر صفدر پنچوانی نے پلٹ کر میری طرف دیکھا

"شہباز۔۔۔" سوزان اسے میری طرف پلٹتے دیکھ کر چیخی "یہ
آنکھوں سے پہچان جاتا ہے کہ ٹرانزسٹر آن ہو چکا ہے یا
نہیں۔" میں یہ سنتے ہی اچھل کر دائیں طرف بھاگا۔

سوزان کی وارننگ بروقت تھی۔ اگر اسے ایک ثانیے
کی بھی تاخیر ہو جاتی تو یقیناً میرا کام تمام ہو چکا ہوتا۔

کسی خفیہ بٹن کو دبانے سے ڈاکٹر صفدر پنچوانی کی کرسی کے
ہتھوں سے دو نالیاں باہر نکل آئی تھیں۔ ان میں سے ایک
سے نیلے شعلے نکل رہے تھے اور دوسری نالی سے کوئی مہلک
گیس۔۔۔۔ شعلے اور گیس میری خالی کی ہوئی کرسی پر بیک
وقت پڑے اور اگلے لمحے ہی کرسی کے بجائے وہاں راکھ کا
ڈھیر پڑا تھا۔ میں اس کرسی پر ہوتا تو یقیناً میں بھی راکھ میں
تبدیل ہو چکا ہوتا۔

ڈاکٹر پنچوانی نے تیزی سے کرسی میری طرف گھمائی۔
گیس اور شعلوں کی دو موٹی دھاریں، تڑپتی مچلتی میری
طرف بڑھیں۔ میں پھر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ ان کی زد
میں آجانے کا مطلب خود کو راکھ کا ڈھیر بنا لینا تھا۔ شعلے کی
موٹی دھاریں میرے بالکل قریب سے ہو کر گزر گئی تھیں۔
اس کے گزرتے ہی میرے دائیں شانے میں اچانک شدید
جلن پیدا ہوئی۔ یہ جلن اتنی تیز تھی جیسے کسی نے میرے
شانے پر دہکتی آگ رکھ دی ہو۔

میرے جھکائی دینے کے باوجود ڈاکٹر پنچوانی اپنا کام کر گیا
تھا۔ جلن اتنی بڑھی کہ میرا پورا بازو بے جان ہو کر رہ گیا
لیکن جنگ ابھی جاری تھی۔

****

وہ دوبارہ میری طرف آیا تو میں تیار تھا۔ میں نے کمرے
میں دائیں طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ اس نے پھرتی سے
میری توقع کے مطابق اپنی کرسی دائیں طرف گھمائی۔ مجھے
اسی کا انتظار تھا۔ میں گھوما اور بائیں طرف چھلانگ لگا دی۔
ڈاکٹر پنچوانی کو شاید مجھ سے اس جھانسے کی امید نہیں تھی۔
اس کی وہیل چیئر اپنے زور میں سیدھی نکل گئی۔

اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا یا سنبھلتا میرا ہاتھ اس کی پشت کی
طرف سے اس کی گردن کو جکڑ چکا تھا۔۔۔ کسی آہنی شکنجے کی
مانند اس نے مچل کر اپنی گردن میری گرفت سے چھڑانے کی
کوشش کی۔ ۔ں مکروہ ایک بے دست و پا انسان تھا۔ حقیقی معنوں

میں بے دست و پا' آدھا آدمی۔ میری گرفت اس کی گردن پر سخت اور مضبوط ہوتی گئی اسے چھوڑ دینا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

وہ ایک جنونی اور پاگل شخص تھا۔ انتقام کی آگ اور ہوس اقتدار نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ وہ ساری دنیا میں تباہی و بربادی کی سنگین علامت تھا۔ میری گرفت اس کی گردن پر مضبوط ہوئی تو اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور سانس رکنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے اپنے بدن کے زور پر آہستہ آہستہ کرسی کا رخ موڑا اور شیشے کی نازک دیوار کے قریب لے جا کر پوری قوت سے اسے آگے دھکیل دیا۔

وہیل چیئر دوڑتی اور شیشے کو توڑتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دنیا پر حکومت کرنے کا خواب سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا گرا اور بکھر گیا۔

''تم جیسے درندہ صفت شیطان کو زندہ رہنے کا مزید حق نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر'' میں نے زور سے چیخ کر کہا ''اس لئے کہ تم دنیا بھر کے انسانوں سے ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق چھیننا چاہتے ہو'' مجھ پر ایک قسم کی دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

میں نے کمرے میں رکھی ایک آہنی سلاخ اٹھائی اور کمپیوٹر پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دنیا کی سب سے عجیب و غریب مشین ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھانچے کی شکل اختیار کر گئی۔ اب اس کے سارے غلام آزاد ہو چکے تھے۔ دنیا بھر میں جس شخص کے بھی ذہن میں اس نے ٹرانسسٹر لگایا تھا۔ وہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ کرہ ارض ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گیا تھا۔

سوزان اپنی جگہ خاموش کھڑی مجھے کمپیوٹر کو تباہ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ یہی چاہتی تھی لیکن اپنی کسی مجبوری کے باعث ایسا نہ کر پائی تھی۔ میں نے سوزان کا ہاتھ پکڑا اور اس عمارت سے باہر نکل آیا۔ عمارت میں بہت سے مریض اور نرسیں موجود تھیں۔ گیٹ پر مسلح محافظ بھی مستعد کھڑے تھے لیکن کسی کو پتہ نہ تھا کہ میں کیا کر آیا ہوں؟

****

میں کراچی پہنچا اور چیف سے ملا تو اسے ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ادھیڑ عمر چیف پہلے تو خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کا بچھڑا ہوا بیٹا' برسوں بعد یکایک اسے مل گیا ہو۔

''تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے شہباز بیٹے'' اس نے پیار سے میری پشت تھپکی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''مجھے اور زیرو ایکس کو تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔'' اس نے مجھے چھوڑ دیا اور یکے بعد دیگرے کئی فون کر ڈالے۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ یقیناً مسٹر زیرو یعنی صدر پاکستان کو میرے کارنامے سے آگاہ کر رہا تھا۔

وہ فون کر کے فارغ ہوا تو اس کی پیار بھری نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ''مسٹر زیرو نے اپنی آج رات کی تمام مصروفیات منسوخ کر دی ہیں۔ تم ان کے ساتھ رات آٹھ بجے خصوصی ڈنر لو گے۔ مسٹر زیرو تم سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ وہ تمہاری زبانی ساری تفصیل سننا چاہتے ہیں۔''

''مگر۔۔۔ مگر۔۔۔'' میں نے پہلے سوزان کی طرف دیکھا جو میرے برابر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر میری نگاہ چیف پر جم گئی ''اس کا کیا بنے گا؟''

زیرو ایکس کے چیف نے اٹھ کر سوزان کے اوپر ہاتھ پھیرا اور شفقت آمیز لہجے میں بولا ''یہ آج سے زیرو ایکس کی مستقل رکن ہیں۔ ضروری تربیت کے بعد انہیں وہ تمام مراعات حاصل ہوں گی جو زیرو ایکس کے ہر رکن کو ملتی ہیں۔''

''اور۔۔۔ اور وہ۔۔۔'' میں نے دانستہ ہلکا سا وقفہ دیا۔

''پنجوانی سسٹرز کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟''

''جہنم میں ڈالو انہیں۔ وہ اب ہمارے لئے بیکار ہیں۔'' چیف نے کہا ''ان کی مرضی' جو چاہے کرتی پھریں۔''

****